Issue Oct - Dec 2025

اولیا کونسل آف نارتھ امریکہ کی پیش کش

سہ ماہی

صوفی ٹائمز

QUARTERLY
SUFI TIMES

ناشر
اولیا کونسل آف نارتھ امریکا

زیر سرپرستی: داعی اسلام شیخ ابو سعید محمدی صفوی

جلد نمبر ۰۳

اولیا کونسل آف نارتھ امریکہ کی پیش کش

سہ ماہی

صوفی ٹائمز

QUARTERLY

SUFI TIMES

Issue - 06
Oct - Dec
2025

شمارہ-06
ربیع الآخر - جمادی الاخری
۱۴۴۶ھ

مدیر اعزازی: مولانا علی سعید صفوی

مجلس ادارت

چیف ایڈیٹر: (انگلش) ڈاکٹر مہدی کاظمی
چیف ایڈیٹر: (اردو) مفتی امام الدین سعیدی
مدیر مسئول: ڈاکٹر جہاں گیر حسن مصباحی
تزئین کار: محمد آفتاب عالم قادری

مجلس مشاورت

مولانا سید کامران چشتی، ڈاکٹر ذیشان مصباحی
ڈاکٹر مجیب الرحمٰن علیمی، مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی
مولانا غلام مصطفیٰ ازہری، مولانا محمد ذکی
ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن

صفحات 79

ای میل auliyacouncil@gmail.com

نوٹ- مضمون نگار کے افکار و نظریات سے ادارے کا اتفاق ہونا ضروری نہیں

Publisher - Auliya Council of North America
85 Mt Hope Rd, Mahopac, NY 10541, United States

فہرست

نورِ عرفان، اداریہ و حکمت و معرفت

شمار نمبر	مضامین	مضمون نگار	صفحہ
۱	ہر پردے میں شفا دینے والا اللہ ہی ہے	داعی اسلام شیخ ابو سعید محمدی صفوی	۶
	فرقہ واریت اور تقابلی بصیرت	ڈاکٹر مہدی کاظمی	۹
۲	محبت کے اسباب اور ذکر کے درجات	ڈاکٹر مجیب الرحمٰن علیمی	۱۵
۳	محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ	مفتی آفتاب رشکِ مصباحی	۱۷
	محبوب سبحانی شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ	مفتی آفتاب رشکِ مصباحی	۲۱
۴	حسن معاشرت اور کامیاب ریاست کے نبوی اصول	ڈاکٹر جہاں گیر حسن مصباحی	۲۷

تحقیقی سیکشن

۵	ابراہیمی مذاہب میں امن و انصاف	حنا اطہر خان	۳۲

نقش خیال

۶	منقبت	شیخ ابو سعید صفوی	۳۷

۷	التجاے مسافر	ڈاکٹر محمد اقبال	۴۰
۸	غزل	محمد شبیر سحر ایم اے علیگ	۴۱

سفرنامہ

۹	روح سفر، کراچی سے نجف و بغداد تک	ڈاکٹر مہدی کاظمی	۴۳
۱۰	سفرنامہ تصاریر کی زبانی		۵۰

سرگرمیاں

۱۱	اولیاء کونسل آف نارتھ امریکہ کی سرگرمیوں کی شان دار تکمیل	محمد آفتاب عالم	۵۸

انگلش سیکشن

۱۲	South Asian Sectarianism: A Comparative Study	۶۳
	Dr. M Mehdi Kazmi	
۱۳	Reaction Paper: Peace and Justice in the Abrahamic Traditions	۶۹
	Hina Athar Khan	
۱۴	Poor Situation of Education in Muslim Society in India A Call to Action	۷۵
	Dr. Jahangir Ahmad	

نورِ عرفان

ہر پردے میں شفا دینے والا اللہ ہی ہے

عرفانی مجلس

افادات از داعی اسلام شیخ ابو سعید محمدی صفوی

مرشد گرامی حضور داعی اسلام ادام اللہ ظلہ علینا کی خدمت میں طرح طرح کے پریشان حال لوگ دعا تعویذ کے لیے آتے رہتے ہیں اور آپ تعویذات دے کر، دعاؤں سے نواز کر، دوائیں تجویز فرما کر یا مریض کے مرض کے اِعتبار سے کسی اچھے ڈاکٹر کا پتا بتا کر اَیسے لوگوں کی باذن اللہ دستگیری فرماتے ہیں لیکن آپ کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایسے لوگ آپ کی بارگاہ سے دنیا کے ساتھ کچھ دین ضرور لے کر جائیں، چناں چہ آپ اُن لوگوں کو حسب حال نصیحت فرماتے ہیں۔ میں نے ایسے لوگوں سے آپ کو بارہا یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

دیکھو! یہ دنیا اَسباب کی جگہ ہے اور اَللہ تعالیٰ نے اَسباب کے اِستعمال کا حکم فرمایا ہے اس لیے کسی بھی پریشانی میں پہلے خود گڑگڑا کر اَللہ کی بارگاہ میں دعا کرو، کیوں کہ اللہ ٹوٹے دلوں کی دعائیں سنتا ہے۔

حدیث قدسی ہے: **أَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبِهِمْ**۔ (کتاب الزہد، احمد بن حنبل، زہد موسیٰ علیہ السلام، حدیث: ۳۹۷)

ترجمہ: میں ٹوٹے ہوئے دلوں سے قریب ہوں۔

اور دوسروں سے خصوصًا بزرگان دین سے دعائیں کراؤ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

دَعْوَةُ الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ لِأَخِيهِ بِظَهْرِ الْغَيْبِ مُسْتَجَابَةٌ۔ (صحیح مسلم، باب فضل الدعا للمسلمین بظہر الغیب، حدیث: ۲۷۳۳)

ترجمہ: ایک مسلمان کی دعا دوسرے مسلمان کے لیے پیٹھ پیچھے مقبول ہوتی ہے۔

ایسے ہی صالحین کی قبروں پر جا کر دعا کرو، کیوں کہ یہاں رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے اور نزول رحمت کے مقامات پر دعائیں قبول ہوتی ہیں

ایسے ہی نیکوں سے ہی تعویذات لو، دم کراؤ، اور بیماری ہو تو ڈاکٹر سے رابطہ کرو لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھو کہ ہر پردے میں شفا دینے والا اللہ ہی ہے،

جب تک اُس کا اِرادہ شامل نہیں ہوگا کوئی چیز نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتی، اِس لیے تمام اَسباب کے اِستعمال کے باوجود اگر مصیبت دور نہ ہو تو ناشکری، جزع و فزع اور گلہ و شکوہ کرنے کی بجائے صبر کرو کہ صبر آدھا ایمان ہے۔ اسی لیے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

عَجِبتُ إِنَّ أَمرَ الْمُؤْمِنِ کُلَّهُ خَیرٌ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ فَشَکَرَ، کَانَ خَیرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ فَصَبَرَ، کَانَ خَیرًا لَهُ۔ (مسند احمد، باب حدیث صہیب، حدیث: ۲۳۹۲۴)

ترجمہ: مومن کی شان بڑی عجیب ہے کہ اُس کے لیے بہر صورت خیر ہے، اگر وہ مسرت و شادمانی میں ہو، اور شکر کرے تو اُس کے لیے خیر ہے، اور اگر مصیبت آئے اور صبر کرے تو اُس میں بھی اُس کے لیے خیر ہے۔

دیکھو! جب ہمارا خالق و مالک ہم کو رَاحت و آرام میں رکھے تو ہمیں شکر کرنا چاہیے کہ اُس سے نعمتوں میں برکت ہوتی ہے اور مصیبت میں صبر کرنا چاہیے اور اُسی کی بارگاہ میں اپنی عاجزی کا اظہار کرنا چاہیے، کوئی بُری بات زبان پر نہیں لانی چاہیے کہ یہی بندگی کا تقاضا ہے۔ لیکن ہم لوگ ایسا نہیں کرتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمیشہ جو ہم چاہتے ہیں وہ ہو جائے اور اَسباب کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگوں کو اگر نیکوں کی دعاؤں اور تعویذات سے فائدہ نہیں پہنچتا تو وہ بزرگوں سے ہی بدگمان ہو کر اُن سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں، یہاں تک کہ بعض لوگ جب دعاؤں سے فائدہ نہیں پہنچتا تو بد عقیدہ ہو جاتے ہیں اور اَللہ تعالیٰ کی ذات سے بھی بدگمان ہو جاتے ہیں اور اِس طرح وہ دولت ایمان سے بھی محروم ہو جاتے ہیں اِس لیے ہمیں ہر حال میں اپنا عقیدہ درست رکھنا چاہیے اور نیکوں سے دین سیکھتے رہنا چاہیے اور اُن کی صحبت میں رہنا چاہیے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ جب آپ نے اِس طرح کی گفتگو فرمائی تو اَیسے لوگوں کے چہرے اِیمانی مسرت سے کھل اُٹھے اور اَیسا محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنا غم بھول گئے ہوں۔

بزرگوں نے سچ ہی فرمایا ہے: **کَلَمَاتِ الْمَشَائِخِ جُنْدٌ مِّنْ جُنُوْدِ اللّٰہِ۔**

ترجمہ: بزرگوں کی باتیں اِمداد الٰہی کی فوج ہے۔ (ترتیب: مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی)

* * *

اداریہ

فرقہ واریت اور تقابلی بصیرت

برصغیر کے تناظر میں ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمود مہدی کاظمی

فرقہ واریت: برِّصغیر کی روح کا گھاؤ

ہمارے برِّصغیر میں ایک ایسا عارضہ رچ بس گیا ہے جس نے ہماری معاشرت کو توڑ ڈالا ہے، ہماری اجتماعی روح کو چیر کر رکھ دیا ہے اور ہمیں دنیا کے سامنے تماشا بنا دیا ہے۔ یہ بیماری ہے **فرقہ واریت**۔ وہ دین جو انصاف، رحمت اور اخوت کا پیامبر تھا—یعنی اسلام—اکثر و بیشتر تلخ فرقہ وارانہ جھگڑوں اور شناخت کی جنگوں میں محدود کر دیا گیا ہے ہر گروہ اس بات پر مصر ہے کہ وہی "برحق فرقہ" ہے اور اسلام کی سب سے درست تعبیر اسی کے پاس ہے، حالانکہ اکثر پیروکار اپنی ہی فرقہ وارانہ داستان سے سطحی آگہی رکھتے ہیں۔ آخر لوگ کیوں ان ٹوٹی پھوٹی شناختوں سے اتنی شدت سے چمٹے رہتے ہیں؟ کچھ کے لیے یہ ہجوم میں پناہ ڈھونڈنے کا ذریعہ ہے تاکہ تنہا کھڑے ہونے کی کمزوری دور ہو۔ دوسروں کے لیے یہ اس بات کا انکار ہے کہ دوسرے جس طرح ایمان لاتے اور جیتے ہیں، وہ بھی معتبر ہو سکتا ہے۔ فرقہ وارانہ وابستگی بعض اوقات انا کو بھڑکا دیتی ہے، جس کے نتیجے میں فرقہ جاتی رہنما اور ہیرو ایسے معبودِ مسجود بن جاتے ہیں جو سب سے زیادہ پاکیزہ اور مقدس مانے جاتے ہیں۔ یہ جھوٹی سربلندی بھی فراہم کر سکتی ہے—ایسی ناپائیدار شناخت جو دوسروں کو کمتر یا گمراہ قرار دے کر قائم کی جاتی ہے۔

فرقہ واریت کی جڑ دراصل اس ابتدائی اور تباہ کن انسانی ضرورت میں ہے کہ "کسی نہ کسی قیمت پر کسی گروہ کا حصہ بننا ہے۔" جب یہ ضرورت قابو میں نہ رہے تو نفرت اور عداوت کو ہوا دیتی ہے۔ نفرت انگیزی کھیل بن جاتی ہے، دوسروں پر غلبہ جمانے کا حربہ اور ان لوگوں کے ہاتھوں میں طاقت کا آلہ جو ان جنگل کے قانون جیسے بیانیوں پر زندہ ہیں۔ نتیجہ یہ کہ معاشرہ بکھر جاتا ہے، اسلامی ورثے کی عظمت چھوٹی چھوٹی

دشمنیوں میں کھو جاتی ہے، اور اتحاد کی روح فرقہ وارانہ غرور کے قدموں پر قربان کر دی جاتی ہے۔

تقابل کی ضرورت: اپنے اور "دوسرے" کے درمیان فرق و مماثلت تلاش کرنا ایک فطری انسانی رجحان ہے۔ انسان خود کو دوسروں میں عکس پا کر، ان سے چیلنج لے کر یا تکملہ حاصل کر کے سمجھتا ہے۔ یہ تقابلی رجحان خاص طور پر ان معاشروں میں نمایاں ہو جاتا ہے جہاں مذاہب، فرقوں یا ثقافتوں کی گوناگونی ہو۔ برِّصغیر جنوبی ایشیا، جو مختلف اسلامی مسالک کے متنوع گروہوں کا گھر ہے، اس تقابلی مطالعہ کے لیے زرخیز سرزمین فراہم کرتا ہے۔ میری کورس **مطالعہ بین الادیان** میں، مجھے *Understanding Religion: Theories and Methods for Studying Religiously Diverse Societies* (یونیورسٹی آف کیلی فورنیا پریس، ۲۰۲۱) میں ایک مضمون ملا جس میں مذاہب کا تقابلی مطالعہ انصاف، ہمدردی اور بصیرت کے ساتھ کرنے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہی طریقہ فرقوں کے مطالعہ پر بھی لاگو کیا جا سکتا ہے۔ اکثر فرقہ وارانہ تقابل اس ایجنڈے کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ برتری ثابت کی جائے، دوسرے کو غیر معتبر ٹھہرایا جائے یا اجتماعی غرور کو مضبوط بنایا جائے۔ لیکن اس طرز کا تقابل صرف تقسیم کو بڑھاتا ہے۔ ایک زیادہ سنجیدہ اور علمی طریقہ ہمیں یہ دیکھنے کا موقع دیتا ہے کہ فرقے اسلام کے متنوع اور بامعنی اظہار ہیں، ہر ایک اپنے رنگ اور اپنی معنویت کے ساتھ۔

فرقہ کے تصور پر دوبارہ غور

لفظ فرقہ عام طور پر منفی معانی لاتا ہے—ٹکڑے ٹکڑے ہونا، شقاق اور تقسیم۔ لیکن بائرن ایئرہارٹ (۱۹۹۳) نے اپنی کتاب *Religious Traditions of the World* میں یہ استدلال کیا کہ مذہب کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ عقائد، رسومات، ادارے اور عملی ڈھانچوں کا ایک ایسا نظام ہے جس کے ذریعے ماننے والے اپنی دنیا کو بامعنی بناتے ہیں۔ اگر اس تعریف کو اپنایا جائے تو فرقہ کو بھی ایک مثبت مفہوم دیا جا سکتا ہے۔

فرقہ بذاتِ خود مذہب نہیں ہوتا، لیکن یہ بڑے مذہبی دھارے کے اندر اظہار کا ایک طریقہ ضرور ہوتا ہے۔ یہ اپنے پیروکاروں کو عبادات، عقائد، اقتدار کے ڈھانچے اور ادارے فراہم کرتا ہے۔ ایمان کے تجربے اور اس کے مجسم اظہار کا ذریعہ بنتا ہے، اور سب سے بڑھ کر ایک مربوط نقطۂ نظر دیتا ہے جو زندگی کے ابدی سوالات کے جواب فراہم کرتا ہے۔ یہاں لیوس ریمبو (۱۹۹۳) اور نینین اسمارٹ (۱۹۹۸) کی بات یاد آتی ہے، جنھوں نے مذہب کو ایک "جہان بینی" کے طور پر سمجھا۔

اسمارٹ نے چھ پہلو بیان کیے: عقیدتی/فلسفیانہ، اساطیری/داستانی، اخلاقی/قانونی، عملی/عبادی، تجرباتی/جذباتی، اور سماجی/ادارہ جاتی۔ جب یہ پہلو فرقوں پر لاگو کیے جائیں توظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ہر فرقے نے اپنی اپنی ترجیحات کا توازن قائم کیا ہے۔ کچھ کے نزدیک قانون اور عبادت کو فوقیت ہے، کچھ کے لیے تجربہ اور عشق اصل ہیں، اور کچھ قیادت اور اقتدار پر زور دیتے ہیں۔ فرقوں کے تقابلی مطالعہ کا مقصد ان ترجیحات کو پہچاننا، ان کا تجزیہ کرنا اور ان کے ماننے والوں کے لیے ان کے مفاہیم کو سمجھنا ہے۔

تقابل کی مشکل: فرقوں کا تقابلی مطالعہ طویل عرصے سے اسلامی علمی روایت کا حصہ رہا ہے، لیکن یہ تنقید کو بھی دعوت دیتا ہے۔ جوناتھن زیڈ اسمتھ (۱۹۹۰) نے خبردار کیا کہ لاپرواہ تقابل "جادوئی عمل" بن جاتا ہے جو جھوٹی مشابہتیں تراشتا ہے اور الگ الگ روایتوں کو مسخ کر دیتا ہے۔ تاہم تقابل سے بچنا ممکن نہیں، کیونکہ انسان ہمیشہ اجنبی کو اسی روشنی میں سمجھتا ہے جو پہلے سے اس کے پاس موجود ہو۔ اصل چیلنج یہ ہے کہ ذمہ دارانہ تقابل کیا جائے۔

ایسا تقابل جو مماثلت اور اختلاف دونوں کو پوری توجہ سے دیکھے۔

جیسا کہ پال ہیجز (۲۰۲۱) نے کہا، بامعنی تقابل کے لیے مماثلت اور تضاد دونوں کو توازن میں رکھنا ضروری ہے۔ صرف یکساں نمونوں پر زور دینا، جیسا کہ پہلے کے محققین مثلاً مرسیا ایلیادے (۱۹۵۹) کرتے تھے، فرقوں کی انفرادیت کو مٹا دیتا ہے۔ سنجیدہ تقابل صرف عقائد پر نہیں بلکہ عملی زندگی رسومات، رویوں، اداروں اور ثقافتی دنیا— پر بھی نظر ڈالتا ہے جس میں فرقے پروان چڑھتے ہیں۔

تقابلی جھلکیاں: دیوبندی، بریلوی اور شیعہ روایتیں:

ان اصولوں کو دیوبندی، بریلوی اور شیعہ فرقوں پر لاگو کرنے سے مشترکہ بنیادیں بھی سامنے آتی ہیں اور گہری اختلافات بھی۔ یہ تینوں قرآن، سنت اور اسلامی تاریخ سے اپنی اصل اخذ کرتے ہیں، لیکن ہر ایک نے اقتدار، نجات، عبادتی زندگی اور شناخت کو سمجھنے کے اپنے الگ الگ طریقے وضع کیے ہیں۔

دیوبندی :

سادگی اور تزکیہ پر زور۔ ان کے عقائد سخت توحید اور بدعت سے اجتناب پر قائم ہیں۔ فقہِ حنفی اور مدرسوں کی سخت تربیت میں جڑیں رکھتے ہیں۔ ان کی عبادات سادہ ہیں— مسجد کی نمازیں، قرآن کا مطالعہ، اور ان اعمال سے پرہیز جو بگاڑ سمجھے جاتے ہیں، جیسے مزارات کی زیارت یا موسیقی کے ذریعے عبادت۔

ان کی ثقافت سنجیدگی اور اصلاح کی نمائندہ ہے، جو نوآبادیاتی دور کے ردِّعمل میں پروان چڑھی (میٹکالف، ۱۹۸۲)۔

بریلوی :صوفی کائنات شناسی اور عقیدت مندانہ اعمال کی تائید۔ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضور ﷺ روحانی طور پر حاضر و ناظر ہیں، اولیاء شفاعت کرتے ہیں اور غیب کے معجزات جاری رہتے ہیں۔ ان کی عبادات رنگین اور جسمانی اظہار پر مبنی ہیں: میلاد کی محافل، عرس، مزارات کی زیارت، نعتیہ شاعری اور قوالی۔ ان کی ثقافت برصغیر کی عوامی روایات، موسیقی اور شاعری سے گہری جڑی ہوئی ہے (سنیال، ۱۹۹۶)۔

شیعہ: امامت کے عقیدے میں سب سے زیادہ منفرد۔ شیعہ مسلمان مانتے ہیں کہ اہلِ بیت سے تعلق رکھنے والے امام ہی برحق رہنما ہیں، جو معصوم اور ایمان کے حتمی شارح ہیں۔ ان کی عبادات یاد اور سوگ پر مرکوز ہیں: امام حسینؑ کی یاد میں عاشورا کی رسومات، اربعین کے جلوس، مجالس اور ماتم۔ ان کی ثقافتی شناخت کربلا سے گہرائی کے ساتھ وابستہ ہے، جو قربانی، مزاحمت اور عدل کے تصور کو جنم دیتی ہے (پنالٹ، ۱۹۹۲؛ حیدر، ۲۰۰۶)۔

تقابلی بصیرتیں

ہیجز کے زاویہ نظر سے چند نکات واضح ہوتے ہیں:

اقتدار :دیوبندی متن اور علما پر بھروسہ کرتے ہیں؛ بریلوی اولیاء اور حضور ﷺ کی روحانی موجودگی کو مانتے ہیں؛ شیعہ اقتدار کو ائمہ کی نسل میں دیکھتے ہیں۔

انسانی مسئلہ :دیوبندیوں کے لیے بدعت، بریلویوں کے لیے غفلت، اور شیعوں کے لیے ظلم اور خیانت۔

نجات:

دیوبندیوں کے نزدیک نجات عبادات کی تطہیر میں ہے؛ بریلویوں کے نزدیک شفاعت اور عقیدت میں؛ اور شیعوں کے نزدیک ائمہ کی وفاداری اور کربلا کی یاد میں شرکت میں۔ یوں تقابل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ تینوں فرقے اسلام کی مشترکہ بنیادوں کے قائل ہیں، لیکن وہ انہیں بالکل مختلف انداز میں زندہ کرتے ہیں۔ بظاہر یکساں اجتماع، ذکر یا عبادات —— در حقیقت الگ الگ معنوی وظائف

سرانجام دیتے ہیں:

دیوبندیوں کے لیے عقیدے کا تحفظ، بریلویوں کے لیے عشق اور شفاعت کی پرورش، اور شیعوں کے لیے عدل اور قربانی کا مجسم ہونا۔

نتیجہ: آخر کار فرقوں کا سنجیدہ تقابلی مطالعہ فرقوں کو ایک دوسرے میں ضم کرنے یا یکساں دکھانے کے لیے نہیں ہوتا۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر فرقے کے تخلیق کردہ منفرد معنوی جہان کو سمجھا جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ سب انسان کے ابدی سوالات—حق، عدل اور قربتِ الٰہی—کے اپنے اپنے جواب فراہم کرتے ہیں۔ دیوبندی، بریلوی اور شیعہ روایات کا ذمہ دارانہ تقابل ہمیں ان کی مشترکہ اسلامی میراث کے ساتھ ساتھ ان کے منفرد جواب بھی دکھاتا ہے جو وہ اقتدار، شفاعت اور راہِ خدا کے سوال پر دیتے ہیں۔

* * *

مراجع(References)

ایئرہارٹ، بائرن ڈی۔ (1993). *Religious Traditions of the World.* ہارپر کولنز۔

ایلیادے، مرسیا۔ (1959). *The Sacred and the Profane: The Nature of Religion.* ہارکورٹ، بریس اینڈ ورلڈ۔

ہیجز، پال۔ (2021). *Understanding Religion: Theories and Methods for Studying Religiously Diverse Societies.* یونیورسٹی آف کیلی فورنیا پریس۔

حیدر، سید اکبر۔ (2006). *Reliving Karbala: Martyrdom in South Asian Memory.* آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

میٹکالف، باربرا۔ (1982). *Islamic Revival in British India: Deoband, 1860–1900.* پرنسٹن یونیورسٹی پریس۔

پنالٹ، ڈیوڈ۔ (1992). *The Shiites: Ritual and Popular Piety in a Muslim Community.* سینٹ مارٹنز پریس۔

ریمبو، لیوس آر۔ (1993). *Understanding Religious Conversion.* ییل یونیورسٹی پریس۔

سنیال، عظمت۔ (1996). *Devotional Islam and Politics in British India: Ahmad Riza Khan Barelwi and His Movement, 1870–1920.* آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

اسمارٹ، نینین۔ (1998). *The World's Religions.* کیمبرج یونیورسٹی پریس۔

اسمتھ، جوناتھن زیڈ۔ (1990). *Drudgery Divine: On the Comparison of Early Christianities and the Religions of Late Antiquity.* یونیورسٹی آف شکاگو پریس۔

- **Dr. M. Mehdi Kazmi**
- President, Auliya Council of North America
- Phone: +1 (914) 525-1945
- E-Mail: montesynapse@gmail.com

حکمت و معرفت

محبت کے اسباب اور ذکر کے درجات

ڈاکٹر مفتی مجیب الرحمٰن علیمی

محبت ایک ایسی قوت ہے جو انسانی دلوں کو جوڑتی ہے اور زندگی میں مسرت، سکون، اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے جو مختلف اسباب کی بنیاد پر پروان چڑھتا ہے۔ اسی طرح ذکر، یعنی اللہ کی یاد، بندے کو اپنے خالق کے قریب کرنے کا ایک ذریعہ ہے، جس کے ذریعے بندہ معرفت، محبت، فنافی اللہ اور بقاباللہ تک پہنچتے ہیں۔

محبت کے اسباب: محبت کے مختلف اسباب ہیں جو دلوں میں جذبات پیدا کرتے ہیں اور تعلقات کو مضبوط بناتے ہیں۔

کمال: ہر انسان فطری طور پر کمال اور حسن کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام کمالات کا مجموعہ ہے۔ جب انسان اللہ کی صفات، جیسے علم، قدرت، اور حکمت کو جانتا ہے تو اس کے دل میں اللہ کی محبت جاگزین ہوتی ہے۔ اسی طرح، انسانی تعلقات میں کسی شخص کے اعلیٰ اخلاق اور کردار انسان کو محبت کی طرف راغب کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات ہر کمال کا حسن اور ہر حسن کے کمال کا جامع ہے، اس لیے سب سے زیادہ ذکر اور سب سے زیادہ محبت کی مستحق اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہی ہے۔

احسان: محبت کا دوسرا بڑا سبب احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا احسان و انعام بے شمار ہے۔ وہ بندے کو بے حساب نعمتیں عطا کرتا ہے، جن کا شمار ممکن نہیں۔ جب بندہ ان احسانات کو یاد کرتا ہے، تو اس کا دل محبت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ انسانی سطح پر بھی کسی کے احسانات دل میں محبت پیدا کرتے ہیں۔ لیکن احسان کرنے والوں میں جو ذات پاک کامل احسان و مہربانی فرمانے والی ذات ہے وہ اللہ رب العزت کی ذات گرامی ہی ہے، اس اعتبار سے بھی اللہ کی ذات محبت کی زیادہ مستحق ہے۔

سخاوت: سخاوت اور فیاضی محبت کے اہم عوامل میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ سخی ہے، جو اپنی مخلوق کو بلا مانگے عطا کرتا ہے۔

اس کی یہ صفت بندے کو اس کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اسی طرح، انسان میں سخاوت کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں محبت کو فروغ دیتا ہے۔

موانست: قربت اور انسیت محبت کا ایک اہم سبب ہیں۔ جب انسان کسی کے ساتھ وقت گزارتا ہے یا اس کی یاد کو حرزِ جاں بنالیتا ہے تو محبت پروان چڑھتی ہے۔ اللہ کی یاد، اس کی عبادت، اور اس کے ساتھ تعلق بندے کے دل میں محبت کی شمع روشن کرتی ہے۔

ذکر کے درجات: ذکر ایک روحانی عمل ہے جو بندے کو اللہ سے قریب کرتا ہے۔ اس کے درجات یہ ہیں:

معرفت: ذکر کا پہلا درجہ معرفت ہے۔ بندہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی ذات کو پہچانتا ہے۔ یہ پہچان بندے کے دل میں عظمت و کبریائی اور خشوع و خضوع پیدا کرتی ہے اور بندے کو اللہ کے قریب کرتی ہے۔ معرفت ہی محبت کی بنیاد ہے، کیونکہ معرفت کے بغیر محبت ممکن نہیں۔

محبت: معرفت کے بعد ذکر کا دوسرا درجہ محبت ہے۔ جب بندہ اللہ کو پہچانتا ہے تو اس کے دل میں اللہ کی محبت جاگتی ہے۔ یہ محبت بندے کو اللہ کی رضا کی تلاش اور اس کی عبادت میں مشغول ہونے پر آمادہ کرتی ہے۔

فنافی اللہ: ذکر کے تیسرے درجے میں بندہ اپنی ذات اور خواہشات کو اللہ کی رضا میں فنا کر دیتا ہے۔ یہ درجہ انسان کی مکمل روحانی وابستگی کی عکاسی کرتا ہے، جہاں بندہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے۔

بقاباللہ: ذکر کا اعلیٰ ترین درجہ بقاباللہ ہے۔ اس مقام پر بندہ اللہ کی مدد سے زندگی گزارتا ہے اور اس کی ہر حرکت اللہ کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ درجہ انسان کو کمالِ عبدیت کی منزل پر پہنچاتا ہے۔

خلاصہ: محبت کے اسباب اور ذکر کے درجات انسان کی روحانی ترقی کے لیے اہم ہیں۔ محبت، چاہے وہ اللہ سے ہو یا انسانوں سے، زندگی میں امن و سکون کا باعث بنتی ہے۔ ذکر کے درجات معرفت، محبت، بندے کو اس کے خالق کے قریب کرتے ہیں اور اس کی زندگی کو مقصدیت اور معنویت عطا کرتے ہیں۔ محبت اور ذکر کا یہ حسین امتزاج انسان کو اعلیٰ روحانی مقامات تک لے جا سکتا ہے۔

* * *

- **Dr. Mufti Mojibur Rahman Alimi**
- Jamia Arifia, India
- Phone: +9190269812116
- E-Mail: mmrahmanalimi@gmail.com

محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ العزیز

آپ کی ذات نہ صرف جماعت صوفیہ کے لیے علمی و عملی معیار ہے بلکہ آپ کا نظام بھی خانقاہی نظام کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے

آفتاب رشکِ مصباحی

محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ (۶۳۶ھ - ۷۲۵ھ) کا شمار ان اکابر صوفیہ میں ہوتا ہے جو علمی طور پر بھی بہت بلند اور صاحب کمال ہوتے ہیں۔ علمی شان کا یہ عالم تھا کہ طالب علمی ہی کے زمانے میں آپ "بحّاث" اور "محفل شکن" جیسے خطابات سے مشہور ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود متواضع اور منکسر المزاج ایسے کہ جب آپ کی دستار بندی ہوئی تو آپ کے ادب و آداب کو دیکھتے ہوئے شیخ جلال الدین تبریزی کے مرید خواجہ علی بزرگ بدایونی نے آپ کے استاد مولانا علاء الدین اصولی سے فرمایا: "اے مولانا! یہ بچہ (خواجہ نظام الدین اولیا) بڑا نیک اور بزرگ ہوگا"۔ چناں چہ زمانے نے دیکھا کہ سلطان جی اپنے وقت کے وہ عظیم بزرگ ہوئے جن کے فیضان سے روئے زمین کا تقریبًا ہر خطہ مستفیض ہوا اور ہو رہا ہے۔

محبوب الٰہی قدس سرہ کی عظمت و رفعت، بزرگی و پیشوائی اور آپ کے فیوض و برکات کا اعتراف جن اکابرین کو رہا ہے ان میں خصوصیت کے ساتھ شیخ جلال الدین ہانسوی، امیر حسن علی سجزی، امیر خرد کرمانی، شیخ شرف الدین احمد یحی منیری، شیخ شعیب فردوسی، شیخ ضیاء الدین برنی، مورخ ابن بطوطہ، مورخ عبد القادر بدایونی، ابو الفضل علامی اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی وغیرہم کے اسما نمایاں ہیں۔

محبوب الٰہی قدس سرہ بدایوں میں پیدا ہوئے، وہیں کے اکابر علما و مشائخ سے تعلیم و تربیت پائی، بلکہ (موجودہ دور کے حساب سے) عالمیت کی دستار بندی بھی بدایوں ہی میں ہوئی۔ اعلی تعلیم کے لیے آپ نے دہلی کا سفر کیا اور تقریبًا چار سالوں تک مسلسل حصول تعلیم میں لگے رہے اور اس طرح علوم متداولہ میں کمال حاصل کیا۔

محبوب الٰہی قدس سرہ کو بابا فرید الدین گنج شکر قدس سرہ سے غائبانہ محبت بدایوں ہی سے تھی، لیکن ان کی بارگاہ میں حاضری کا شرف ۶۵۵ھ میں ملا اور آپ اسی سفر میں بابا صاحب سے مرید ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر بیس سال تھی۔ چار سال کے بعد تیسرے سفر اجودھن میں بابا صاحب نے آپ کو سلسلہ چشتیہ کی خلافت و اجازت عطا فرمائی۔ اس کے بعد آپ دہلی لوٹ آئے۔ یہاں یہ بات خصوصی توجہ چاہتی ہے کہ عموماً لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر انھیں کہیں کسی سے خلافت و اجازت مل گئی تو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ سب کچھ ہو گئے۔

اب انھیں کسی چیز کی حاجت نہیں۔ لہٰذا، حصول علم کی ساری کوششیں یک لخت ترک ہو جاتی ہیں۔ اور اِس دور میں خلافت کی تو دور، ظاہری فراغت ہو جائے تو تحصیل علم کی ضرورت باقی نہیں سمجھی جاتی، بلکہ مطالعہ سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ لیکن، حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ نے ایک نمونہ اپنی زندگی میں جو پیش کیا ہے اسے ہر ایک کو اور کم از کم صوفیہ سے نسبت رکھنے والے ہر شخص کو تو ضرور روبہ عمل لانا چاہیے کہ سلطان جی خلافت پانے کے بعد جب دہلی لوٹے تو لوگوں کی فوری رشد و ہدایت کی بجائے مزید تحصیل علم میں مشغول ہونا زیادہ ضروری جانا اور تقریباً دس سالوں تک اس وقت کے عظیم محدث مولانا کمال الدین سے فن حدیث کا درس لیا اور اس میں مہارت حاصل کر کے ۶۷۹ھ میں سند حدیث سے نوازے گئے۔ حالاں کہ وہ تقریباً پندرہ سالوں پہلے ہی فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ گویا سلطان جی نے سلسلہ تصوف کے لیے اپنی زندگی کے ذریعہ یہ معیار قائم کر دیا کہ ایک صوفی کے لیے سب سے پہلے لازم ہے کہ وہ علوم شرعیہ عقلیہ و نقلیہ میں خوب مہارت حاصل کرے تا کہ وہ لوگوں کی درست رہ نمائی کے قابل ہو سکے۔ اور اگر کوئی صوفی دینی علوم سے بے بہرہ ہے، اسے دین (اسلام، ایمان اور احسان/ عقیدہ، فقہ اور تصوف) کی صحیح سوجھ بوجھ نہیں ہے تو ایسا شخص کم از کم سلطان جی کے منہج پر تو نہیں ہے۔

سلطان جی کے اس منہج علم کا ایک اور پختہ ثبوت یہ بھی ہے کہ جب آپ کے بعض خاص حاضر باشوں نے شیخ اخی سراج کو خلافت دینے کی گزارش کی تو آپ نے یہ کہتے ہوئے صاف انکار کر دیا کہ وہ عالم نہیں ہیں انھیں خلافت نہیں دی جا سکتی۔ خیر، اسی مجلس میں مولانا فخر الدین زرادی بھی موجود تھے جنھوں نے انھیں عالم بنانے کی ذمہ داری لی اور چھ مہینہ میں عالم بنا دیا جس کے بعد سلطان جی نے شیخ اخی سراج کو خلافت و اجازت دی۔ آج انھیں صوفیہ کے پیرو کار سمجھے جانے والے خانقاہی حضرات بلا جھجھک غیر عالموں کو، بلکہ عوامی نعت خوانوں، بے علم مقرروں اور جلسے کے ناظموں تک کو خلافت و اجازت بانٹنے میں مکمل فراخ دلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

حالاں کہ سلطان جی کا منہج یہ تھا کہ عالم باعمل کے علاوہ کسی کو خلافت و اجازت نہیں دی جا سکتی۔ سلطان جی بدایوں سے اعلی تعلیم کے لیے جو دہلی گئے تو کافی لمبے عرصے تک دہلی ہی میں مقیم رہے۔ لیکن، بعد میں دہلی کے باہر دریائے جمنا کے کنارے ایک غیر معروف علاقہ ”غیاث پور“ (موجودہ بستی نظام الدین، نئی دہلی) میں سکونت اختیار کر لی اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے، جہاں آج آپ کی خانقاہ اور مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔ غیاث پور قیام کے دوران جب لوگوں کا ہجوم آپ کی طرف متوجہ ہوا اور آپ لوگوں کی اصلاح و تربیت کی طرف مائل ہوئے تو آپ نے خدمت خلق سے ابتدا کی۔ آپ لوگوں کو یہ تنبیہ فرماتے کہ جو کچھ تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کرو۔ آپ نے شکستہ دلوں کو راحت پہنچانے اور انھیں ایک دوسرے سے جوڑنے پر خصوصی توجہ فرمائی۔ آپ ہر شخص کو خدمت کرنے کی ترغیب دیتے اور فرماتے: **”جو خدمت کرتا ہے مخدوم ہو جاتا ہے“**۔

آپ نے اپنی خانقاہ کا دروازہ ہر آنے جانے والے کے لیے کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ یہاں آنے میں نہ کسی کی ذات پات مانع ہوتی تھی، نہ ہی آنے والے کے ساتھ مذہب اور دھرم کے نام پر بھید بھاؤ ہوتا تھا۔ یہاں امیر و غریب، مسکین و نادار ہر قسم کے لوگ آتے جنھیں وقت پر لنگر ملتا۔ اور جو ضرورت مند اور حاجت مند ہوتے انھیں خانقاہ میں آئے ہوئے نذر و نیاز اور فتوحات سے نوازا جاتا۔

آپ کا ارشاد ہے کہ کل بازار قیامت میں ٹوٹے ہوئے/شکستہ دلوں کو آرام پہنچانے سے زیادہ قیمتی کوئی شے نہ ہوگی کہ یہی اصل خدمت ہے۔ جو لوگ دنیا میں کسی وجہ سے پریشان ہیں، دبے کچلے ہیں، مظلوم ہیں، فقر و فاقہ میں جی رہے ہیں، غربت و مفلسی کے شکار ہیں ایسے لوگوں کی داد رسی کرنا، ان کی ضرورتیں پوری کرنا، ان کی بہتر زندگی کے لیے انتظام کرنا، حسب استطاعت ان کی پریشانیوں کو دور کر کے ان کے دلوں کو سکون بخشنا یہ اس خانقاہی نظام کا حصہ تھا جس کی بنا سلطان جی نے غیاث پور میں ڈالی تھی۔ اس نظام خانقاہی میں آنے والے نذر و نیار اور فتوحات ذخیرہ اندوزی اور عیش کوشی کے لیے نہیں، خلقِ خدا کی داد رسی اور ان کی ضروریات پر خرچ کرنے لیے قابل قبول تھے۔ سلطان جی نے جس نظام خانقاہی کو متعارف کرایا تھا اس میں جاہ و منصب اور کشف و کرامت کی بجائے خدمت خلق، عبادت و ریاضت، اتباع رسول، تمسک بالقرآن، انسان دوستی، علم و ادب، صدق و امانت، حیا و پاک دامنی، صلح و رواداری ہی سب کچھ تھیں۔ آپ کی ذات پختہ علم، مضبوط کردار اور اعلی روحانیت کی آئینہ دار تھی۔ اسی لیے آپ نے عوام الناس کے ساتھ اس وقت کے صاحبان علم و فضل کی اصلاح و رہ نمائی فرمائی جن کے بحث و مباحثے، نکتہ آفرینیوں، طلاقت لسانی اور منطقی طرز

استدلال سے شہر کا ذی علم طبقہ متاثر تھا، اور انھیں اس قابل بنایا کہ وہ آپ کے طرز اصلاح کے مطابق خلقِ خدا کی رہ نمائی کر سکیں۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی، شیخ شمس الدین یحی اودھی، مولانا فخر الدین زرادی، مولانا وجیہ الدین پائلی، مولانا قطب الدین منور، مولانا علاء الدین نیلی، مولانا برہان الدین غریب، مولانا اخی سراج عثمان، قاضِی محی الدین کاشانی، مولانا حسام الدین ملتانی، مولانا شہاب الدین جیسے اہل علم کے علاوہ سیکڑوں جید اور متبحر علما شامل ہیں۔ ان اکابر علما و مشائخ کی اصلاح اور عوام الناس کی دینی رہ نمائی کا یہ نتیجہ نکلا کہ عوام و خواص سب کے اندر دینی بیداری آئی۔ لوگ نیکی اور تقوی سے قریب ہوئے، عبادات کا رجحان عام ہوا، دینی ذوق پروان چڑھا، ذکر و تلاوت کی کثرت ہوئی، فرائض و واجبات کے ساتھ نوافل -چاشت و اشراق، صلاۃ اوابین، تہجد وغیرہ- کا اہتمام ہونے لگا۔

حضر تو حضر، سفر میں بھی لوگوں کی عبادتیں ترک ہونا بند ہوگئیں۔ جگہ جگہ چبوترے بن گئے، وضو کے لیے پانی کا انتظام ہو گیا تاکہ کسی مسافر نماز ادا کرنی ہو تو اسے کوئی پریشانی نہ ہو۔ زبانیں صاف ستھری اور پاکیزہ ہوگئیں۔ لوگ عوامی جگہ پر بھی اچھی باتوں کا اہتمام کرنے لگے۔ گناہ کو گناہ سمجھا جانے لگا۔ چوری، ڈکیتی، مار پیٹ، دنگا فساد، گالی گلوج، آپسی جھگڑے، طعن و تشنیع، الزام تراشی و بہتان بازی جیسے برے اخلاق میں گراوٹ آنے لگی۔ دکان داروں اور کارو باری لوگوں میں جھوٹ، ناپ تول میں کمی، مکر و فریب، دھوکا دہی، مارکیٹ ریٹ سے زیادہ پیسہ لینا، سودی کاروبار کرنا وغیرہ قطعی طور پر ختم ہو گئے۔ اس طرح ہر طرف امن و امان، خوش حالی اور دین داری کی فضا عام ہوئی۔ عوام تو عوام حکمراں طبقے، فوجی اور سرکاری محکمے تک سے جڑے لوگوں میں ایمان داری، انصاف پروری اور خیر خواہی کے جذبات عام ہوئے۔ علم و ادب اور مطالعہ و مکالمہ کے ساتھ ہندو مسلم رواداری کو فروغ ملا۔

یہ سب سلطان جی کی کوششوں کا اور ان کے نظام اصلاح اور خانقاہی منہج کا نتیجہ تھے۔ آج بھی اگر خانقاہیں —جن کا اصل مقصد ہی سماج میں امن و امان قائم کر کے بندوں کی مثبت اصلاح کے ذریعہ انھیں اللہ کا قریبی بنانا ہے- سلطان جی کے اس منہج کو اختیار کریں تو ایک بار پھر دنیا امن و شانتی اور دین داری و خیر خواہی کا عام نظارہ کرے گی۔

- **Mufti Aftab Rashk e Misbahi**
- Research Scholar, BRA Bihar University
  Muzaffarpur Bihar
- Phone: +91 90767 66235
- E-Mail: aftabrashk@gmail.com

* * *

محبوب سبحانی شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ

اپنی ضروریات و حاجات اللہ کے حضور رکھنا، اسی پر اعتماد کرنا، اس کے علاوہ کسی سے امید نہ لگانا، اسی سے ہر چیز مانگنا، ، ہمیشہ توحید پر قائم رہنا

آفتاب رشکِ مصباحی

محبوب سبحانی شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ (۴۷۰ھ–۵۶۱ھ) کا شمار ان اکابر اولیا میں ہوتا ہے جو توحید اعتقادی کا عملی مظہر اور اسی کے داعی و مبلغ ہوتے ہیں۔ آپ کی تعلیمات کا اصل الاصول توحید ہے۔ جیسا کہ آپ نے اپنے صاحب زادے شیخ عبد الوہاب قادری رحمہ اللہ کو وصیت کی تھی: ” اپنی ضروریات و حاجات اللہ کے حضور رکھنا، اسی پر اعتماد کرنا، اس کے علاوہ کسی سے امید نہ لگانا، اسی سے ہر چیز مانگنا، ، ہمیشہ توحید پر قائم رہنا کہ توحید ہی تمام نیکیوں کی جامع ہے “۔ (فتوح الغیب، مقالہ:۷۹)

آپ پر توحید کا ایسا غلبہ ہے کہ ایک مقام پر طالبین آخرت کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

” اے دنیا و آخرت کے پرستارو! تم ابھی اللہ اور اس کی بنائی ہوئی دنیا کی حقیقت سے ناواقف ہو۔ تم نے اپنے اور اللہ کے درمیان دیواریں کھڑی کر لی ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ کسی نے دنیا کو اپنا بت بنا رکھا ہے تو کوئی آخرت کا پرستار ہے۔ کوئی خواہش و لذت کا اسیر ہے تو کوئی مخلوق کی تعریف و ستائش اور پذیرائی کا خواہاں ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ ایک بت ہے۔ طالبین مولی کو صرف اور صرف اللہ ہی کا طالب رہنا چاہیے۔ (جلاء الخاطر، ص:۱۹)

آپ دعوت و تبلیغ، ارشاد و ہدایت، اخلاق و کردار کے ساتھ کشف و کرامت ہی کے امام نہیں تھے۔ بلکہ ان تمام خوبیوں کے ساتھ آپ عظیم مفسر، بڑے محدث، ماہر مفتی، زمانہ شناس فقیہ اور نحوی و بلاغی بھی تھے۔

علم و عمل اور اخلاق و روحانیت کے اس آفتاب عالم تاب کو اللہ نے قوت گویائی اور تاثیر سخن بھی بلا کی عطا فرمائی تھی۔ آپ کے وعظ و خطاب کے دوران سامعین پر ایک قسم کی وجدانی و روحانی کیفیت طاری رہتی، پوری محفل آہ و بکا اور رقت آمیز کیفیت سے دوچار رہتی اور جب آپ اپنی تقریر سے فارغ

ہوتے تو سامعین کی ایک بڑی تعداد اپنے سابقہ گناہوں سے تائب ہوچکی ہوتی۔

معاصرین سے لے کر بعد کے ادوار تک جن بلند و بالا القاب وخطابات سے ائمہ و محدثین نے آپ کو یاد کیا ہے اور آپ کے تبحر علمی، دینی ثبات قدمی، روحانی بلندی کا اعتراف کیا ہے، آپ کے بعد کسی کو اس طرح یاد نہیں کیا گیا ہے۔ چناں چہ آپ کی عظمت و شان بیان کرنے والوں میں شیخ علی بن ہیتی، شیخ ابو سعد قیلوی، شیخ ابو العباس سید احمد کبیر رفاعی، شیخ ابو نجیب سہروردی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ ابو مدین شعیب مغربی، شیخ عبداللہ یافعی، امام عبدالوہاب شعرانی، امام سمعانی، حافظ ابن جوزی، حافظ عبد الغنی مقدسی، حافظ ابن قدامہ حنبلی، امام برزالی اشبیلی، امام ابن النجار، امام عزالدین بن عبدالسلام، امام نووی، شیخ ابن تیمیہ (شیخ ابن تیمیہ قادری سلسلہ میں صاحب خرقہ ہیں)، حافظ ذہبی، حافظ ابن قیم الجوزیہ، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن رجب حنبلی، حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہم جیسے سلاطین تصوف و عرفان، اساطین علم وفن اور اکابرین فقہ وحدیث شامل ہیں۔

حضرت محبوب سبحانی قدس سرہ کی ولادت جیلان کے نواحی خطہ ”نیف“ میں ہوئی۔ آپ نجیب الطرفین سید یعنی والد کی طرف سے حسنی اور والدہ کی طرف سے حسینی ہیں۔ آپ کی پیدائش کے ایک سال بعد ہی والد بزرگوار شیخ ابوصالح سید موسی جنگی دوست رحمہ اللہ کا وصال ہو گیا تھا۔ چناں چہ یکہ وتنہا ہونے کے باوجود آپ کی والدہ ماجدہ ام الخیر سیدہ فاطمہ رحمہا اللہ نے آپ کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا۔ تیرہ/ چودہ سال تک آپ جیلان میں تعلیم حاصل کرتے رہے ۔ پھر اعلی تعلیم کے لیے بغداد تشریف لے گئے، جہاں متداول علوم فنون مثلاً: تفسیر، حدیث، فقہ، ادب و بلاغت اور تصوف کی تعلیم ان علوم وفنون کے ماہر اساتذہ وائمہ سے حاصل کیا جن میں خصوصیت کے ساتھ امام محمد بن حسن باقلانی، امام محفوظ بن احمد کلوذانی، امام ہبۃ اللہ ابن مبارک سقطی، امام یحی بن علی تبریزی، شیخ حماد بن دباس اور شیخ مبارک مخزومی بہت نمایاں ہیں۔ کتب تواریخ و سیر آپ کے سفر بغداد کے سلسلے میں اس بات پر متفق ہیں کہ بغداد جانے کے بعد آپ کا کوئی ایک مستقر نہیں تھا۔ بلکہ آپ وقتا فوقتا جگہ تبدیل کرتے رہتے جس کی وجہ سے آپ کو بے شمار مصائب سے دوچار بھی ہونا پڑا۔ رہنے سہنے کی دقت، کھانے پینے کی پریشانی اور اسی کے ساتھ گزراوقات کے لیے معاشی تنگ ودو۔

آپ خود فرماتے ہیں: ”جس قدر بکثرت مشقتیں اور دقتیں مجھ پر پڑتی تھیں اگر کسی پہاڑ پر پڑتیں تو وہ ریزہ ریزہ ہوجاتا“۔ (قلائدالجواہر، ص:۱۹۷)

بسا اوقات تو کئی کئی دن کے فاقے ہو جاتے اور بھوک ایسی محسوس ہوتی گویا جان ہی نکل جائے گی۔

ایسے ناگفتہ بہ حالات میں دریائے دجلہ کے کنارے اور صحراؤں میں اُگ آنے والے خود رو پودے: گھاس، پھوس اور جنگلی سبزوں کی پتیوں سے اپنی بھوک مٹاتے۔ ایسی مشقت و پریشانی میں کوئی دوسرا ہوتا تو یہ کہتا ہوا اپنے وطن لوٹ جاتا کہ: جان بچی تو لاکھوں اور پائے۔ مگر آپ سراپا صبر و استقلال بنے ڈٹے رہے، ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کیں، لیکن اکتساب علم و فیض میں کسی طرح کی کمی آنے نہیں دی اور اپنے کام میں مخلص لوگوں کی یہی پہچان بھی ہے کہ کسی قیمت پر وہ اپنے کام سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ تعلیمی حصولیابیوں کے ساتھ حضرت محبوب سبحانی قدس سرہ بڑے سخت مجاہدات بھی کیا کرتے تھے۔ اکثر صحراؤں، جنگلوں اور بیابانوں میں ایسے گشت کرتے ہوتے کہ انھیں کوئی پہچان نہیں پاتا تھا۔ اس طرح تعلیم و تربیت اور ریاضت و مجاہدہ کرتے تقریبا عمر کے چالیس/ پینتالیس سال گزر گئے تب جا کر آپ لوگوں کی تعلیم و تربیت اور رشد و ہدایت کی طرف مائل ہوئے جس کی وجہ آپ کے مرشد خلافت و اجازت شیخ ابو سعید مبارک مخزومی رحمہ اللہ بنے۔ شیخ مخزومی نے آپ کو اپنا خلیفہ و مجاز بنا کر اپنے قائم کردہ ”مدرسہ لطیفیہ“ باب الازج، بغداد میں درس و تدریس پر مامور کیا جہاں آپ نے درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور فتوی نویسی کے ساتھ وعظ و خطابت کے ذریعہ خلق خدا کی دینی، علمی، فکری اور اصلاحی رہ نمائی فرمائی۔ چناں چہ آپ کے تلامذہ اور خلفا میں آپ کی اولاد (شیخ عبد الوہاب، شیخ عبد الرزاق، شیخ عبد العزیز وغیرہم) کے علاوہ بے شمار اکابرین علم و عرفان شامل ہیں، جن میں خصوصیت کے ساتھ شیخ ابو علی حسن قادسی، حافظ عبد الغنی مقدسی، شیخ عمر بن مسعود بزاز، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ علی بن ابراہیم حداد یمنی، شیخ محمد بن بطائح، شیخ بدیع الدین شارعی، شیخ ابو السعود حریمی وغیرہم سرفہرست ہیں۔ آپ صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ آپ کی طرف جن کتابوں کا انتساب کیا جاتا ہے ان میں فتوح الغیب، الفتح الربانی، غنیۃ الطالبین، جلاء الخاطر نمایاں ہیں۔

حضرت محبوب سبحانی قدس سرہ نے جس دور میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا شروع کیا اس دور میں حکومت سے لے کر رعایہ تک اور عوام سے لے کر خواص تک ہر طبقے میں افتراق و انتشار، فتنہ و فساد اور دین سے دوری اور بے راہ روی کا بازار گرم تھا۔ ایسے وقت میں اس بگڑے ہوئے ماحول کو درست کرنے کے لیے جس ایمانی کیفیت اور جلالی لہجے کی ضرورت تھی اللہ رب العالمین نے اس لہجے سے آپ کو بھرپور حصہ بھی عطا کیا تھا اور

آپ کی طرف لوگوں کے قلوب کو بھی مائل کر دیا تھا تاکہ لوگ آپ کی باتیں سن کر اپنی اصلاح کر سکیں۔

ایک مرتبہ آپ نے اپنے مریدوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”اے منافق! اے مخلوق اور اسباب کے پجاری! اے اللہ کو بھلا دینے والے! تم چاہتے ہو کہ ان سب بداعمالیوں کے باوجود تمھیں عزت اور قدر و منزلت حاصل ہو جائے۔ ہرگز نہیں! نہ تمھارے لیے کوئی عزت ہے اور نہ کوئی قدر و منزلت۔ پہلے اسلام لاؤ، پھر توبہ کرو، پھر علم سیکھو، پھر عمل کرو، پھر اخلاص حاصل کرو۔ ورنہ تم ہدایت نہیں پا سکتے“۔

(الفتح الربانی، مجلس:۳)

اپنے دور کے ظاہر داروں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”صرف اولیاء اللہ کے نام لینے، ان کے احوال و کرامات بیان کرنے، ان کی طرح لباس پہننے اور ان کی طرح باتیں کرنے پر اکتفا نہ کرو، کیوں کہ اگر تم ان کے اخلاق و سیرت اور طرز عبادت کی پیروی نہ کروگے، ان کے نقش قدم پر نہ چلوگے تو یہ سب ظاہر داریاں تمھیں کچھ فائدہ نہیں دیں گی۔ تمھاری حالت تو یہ ہے کہ تم سراپا کدورت ہو، صفائے باطن سے بالکل خالی ہو۔ تمھارے دل و دماغ میں مخلوق ہے، خالق نہیں۔ تم طالب دنیا ہو، طالب آخرت نہیں۔ تم ظاہر پرست باطل کے دلدادہ ہو، حقیقت اور باطن سے تمھیں کوئی علاقہ نہیں۔

تم قول کے غازی ہو، عمل اور اخلاص کے مؤمیداں نہیں ہو۔ (السابق، مجلس:۴۹)

ایک مقام پر آپ نے فرمایا: ”اے تصنع اور دکھاوا کرنے والے! تو کس حال میں مبتلا ہے! اگر نفس، خواہش، طبیعت، جہل اور بدخلقی تجھ پر حاوی ہے تو محض دن کے روزے، رات کے قیام اور کھانے پینے کے معاملے میں خود پر سختی برتنے سے تجھے اللہ کا قرب میسر نہیں ہوگا، اس سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا ہے۔ اپنے اندر اخلاص پیدا کرو اور بری عادتوں، بری خصلتوں سے اپنے آپ کو پاک کرو“۔ (جلاء الخاطر، ص:۴۵)

مزید ایک جگہ اس طرح گویا ہوتے ہیں:

”قرب الٰہی محض ظاہری اعمال سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ نعمت پہلے قلب پھر جسم سے متعلق اعمال کے انجام دینے سے ملتی ہے“۔ (السابق، ص:۴۸)

عوام تو عوام خواص میں بھی اب زرق برق لباس، اونچے اور موٹے عمامے، سرمئی آنکھوں کے ساتھ نرم و ملائم مخملی قالینوں پر مسند آرائی اور ارد گرد دریں چہ شک کہنے والوں کے ہجوم کا نام تقویٰ ہوتا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے آپ کا ارشاد ہمیں اپنے

اندرون میں جھانکنے اور اپنی اصلاح کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں: ”تقویٰ کی حقیقت تو یہ ہے کہ جو کچھ تمھارے دل میں ہو اسے ایک صاف شفاف طشت میں نکال کر رکھو، پھر اسے بھرے بازار میں لے کر پھرو جہاں ہر ایک کی نظر اس طشت پر پڑے اور اس میں کوئی ایک بھی ایسی چیز نہ ہو جس کی وجہ سے لوگوں کے سامنے لے جانے میں تمھیں حیا آئے“۔ (الفتح الربانی، مجلس: ۵۲) اس کے علاوہ شیخ لوگوں کو تواضع و انکساری کی خصلت اپنانے کا درس دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ”تواضع یہ ہے کہ تم جس کسی سے ملو- خواہ وہ تم سے چھوٹا ہو یا بڑا، عالم ہو یا جاہل، متقی ہو یا فاسق و بد عمل، مومن ہو یا کافر- اسے اپنے سے افضل اور بہتر جانو اور اپنے دل میں یہ گمان رکھو کہ اللہ نے کوئی تو ایک خوبی اسے ایسی دی ہوگی جو تم میں نہیں ہوگی اور وہ اسی خوبی کی وجہ سے اللہ کے نزدیک تم سے بہتر و برتر ہوگا“۔ (فتوح الغیب، مقالہ: ۷۸)

اسلام کا اولین مطمحِ نظر انسانیت کی بھلائی، خیر خواہی اور ان کی داد رسی رہی ہے۔ اسی لیے پیغمبر اسلام ﷺ نے سب سے زیادہ زور خلق خدا کی خدمت پر دیا ہے۔ آپ کے سچے جانشین محبوب سبحانی شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ سلوک و تصوف کے جس انقلابی نظام کو لے کر اٹھے تھے اس میں صفائے قلب اور اخلاص نیت کے ساتھ خدمت خلق کو بھی بڑا درجہ حاصل تھا۔ چناں چہ ایک مقام پر آپ فرماتے ہیں ”اپنے ہاتھوں کو دنیا میں خرچ کرنے کا عادی بناؤ اور اپنے دلوں میں دنیا سے بے رغبت رہنے کی عادت ڈالو۔ فقرا کو عطا کرنے میں بخل سے کام نہ لو۔ جب تم سے کوئی کچھ مانگے تو منع مت کرو، ورنہ جب تم اللہ سے مانگوگے تو وہ بھی تمھاری دعاؤں کو رد کردے گا اور کیوں کر رد نہ کرے گا حالاں کہ تم نے اس کے تحفے کو رد کردیا۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ دروازے پر آنے والا سائل اللہ کی طرف سے بندے کے لیے بھیجا گیا تحفہ ہے۔ تمھیں اس بات پر شرم نہیں آتی کہ تمھیں اپنے پڑوسی کی محتاجی اور فاقے کا یقینی علم ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود تم اپنے باطل گمان کی وجہ سے اسے کچھ نہیں دیتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ صرف اپنی غربت کا دکھاوا کر رہا ہے، ورنہ اس نے اپنے پاس سونا چھپا رکھا ہے۔

تم مدعی ایمان ہو کر سو جاتے ہو حالاں کہ تمھارا پڑوسی بھوکا ہوتا ہے، تمھارے پاس زائد کھانا موجود ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود تم یہ کھانا اس محتاج کو نہیں دیتے۔ بہت جلد تمھارا مال تم سے چھین لیا جائے گا، نیز تمھارا دسترخوان بھی تمھارے سامنے سے اٹھا لیا جائے گا۔ تم ذلیل و محتاج بن کر اس دنیا

سے جدا ہو جاؤ گے جسے تم نے اپنی محبوب بنایا ہوا ہے (جلاء الخاطر، ۱۷۸)

”جس نے دنیا میں کسی کو کھلایا ہو گا قیامت کے دن اسے کھلایا جائے گا۔ جس نے دنیا میں کسی کی پیاس بجھائی ہو گی قیامت کے دن اس کی پیاس بجھائی جائے گی۔ جس نے دنیا میں کسی کو پہنایا ہو گا قیامت کے دن اسے پہنایا جائے گا اور جس نے دنیا میں کسی پر رحم کیا ہو گا قیامت کے دن اس پر رحم کیا جائے گا“۔ (السابق، ص:۱۳٦)

حضرت محبوب سبحانی قدس سرہ کی یہ وہ تعلیمات و ارشادات ہیں جن پر آج کے دور میں واعظین و خطبا کی کرامت بیانیوں نے پردہ ڈال دیا ہے۔ کاش صوفیہ سے نسبت کا دم بھرنے والے محبوب سبحانی کی مذکورہ ہدایات کو عملی جامہ پہناتے تو ہمارا مذہبی منظر نامہ کچھ اور ہی ہوتا۔

❖❖❖

- **Mufti Aftab Rashk e Misbahi**
- Research Scholar, BRA Bihar University
  Muzaffarpur Bihar
- Phone: +91 90767 66235
- E-Mail: aftabrashk@gmail.com

حسن معاشرت اور کامیاب ریاست کے نبوی اُصول

ڈاکٹر جہاں گیر حسن مصباحی

بلاشبہ سیرت نبوی کا مطالعہ ہمیں زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ سیرت نبوی کے تین بنیادی ادوار ہیں، جو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ایک فرد سے ایک ریاست تک کا سفر کیسے طے ہوتا ہے، اور کن اُصولوں پر چل کر ہم نہ صرف اپنی دنیا بلکہ آخرت کو بھی سنوار سکتے ہیں۔ سیرت کے تینوں ادوار سے ملنے والے اَسباق کا ایک سرسری جائزہ پیش ہے:

ا۔ پہلا دور چالیس سالہ زندگی: یہ دور، اعلانِ نبوت سے پہلے کا ہے۔ اِس عہد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بظاہر ایک عام انسان کی طرح بسر ہوتی ہے، لیکن آپ کا کردار غیر معمولی رہتا ہے۔ اِس عہد کی خصوصیات اور اِس سے حاصل ہونے والے اَسباق ہماری شخصیت کی تعمیر کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً

صداقت وامانت داری: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا یہ ایک نمایاں سبق ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے اعلان سے پہلے ہی اپنی صداقت اور دیانت داری کی ایسی مثال قائم فرمائی کہ ہر شخص، چاہے وہ آپ کا دوست ہو یا دشمن، آپ کو ”صادق وامین“ کہہ کر پکارنے پر مجبور ہو گیا۔ آج کے زمانے میں جہاں جھوٹ، فریب، دغا اور خیانت عام ہے، سیرت کا یہ پہلو ہمیں بتاتا ہے کہ کسی بھی شخص کی حقیقی قدر اُس کے اخلاق اور کردار سے ہوتی ہے، نہ کہ اُس کے عہدے یا دولت سے۔

عمدہ اخلاق اور حسن سلوک: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ایسے تھے کہ آپ کا بدترین دشمن بھی آپ کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نرمی، بردباری اور رحم دلی سے پیش آتے تھے۔ غریبوں، یتیموں ، بیواؤں کی مدد، پڑوسیوں کے حقوق کا خیال، اور چھوٹے بڑے کے ساتھ

شفقت واحترام کا معاملہ رکھنا آپ کے عظیم الشان اخلاق کا اہم حصہ تھا۔

لہٰذا ہمیں بھی اپنے اخلاق کو بہتر سے بہتر بنانا چاہیے اور عام مخلوقات کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا چاہیے۔ اچھا اخلاق نہ صرف دنیا میں عزت کا باعث بنتا ہے بلکہ آخرت میں بھی اِس کی بے حد اہمیت ہے۔

کسب اور خود اِنحصاری: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی محنت اور مشقت کے ساتھ بسر فرمائی۔ بچپن میں بکریاں چَرائی، جوانی میں تجارت کی، ذاتی کسب و محنت سے اپنے گزر بسر کا سامان مہیا فرمایا، اور کبھی کسی پر بوجھ نہیں بنے، بلکہ آپ نے ہمیشہ خود اِنحصاری کا ثبوت پیش فرمایا۔ اِس اعتبار سے ہمیں بھی کاہلی اور سستی کو ترک کردینا چاہیے اور اپنی روزی-روٹی کے لیے محنت و مشقت کرنی چاہیے۔ سیرت نبوی کا یہ پہلو دوسروں پر اِنحصار کرنے کے بجائے خود کفیل ہونے کی ترغیب و تحریک دیتا ہے۔

فطری پاکیزگی اور شرک بیزاری: تاریخ شاہد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل چالیس سال تک ایک ایسی قوم کے درمیان رہے جو فخریہ طور پر بت پرستی، شراب نوشی، زنا اور جوئے کی عادی تھی۔ پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہر طرح کے کفر و شرک اور تمام تر خرافات و بداخلاقیات سے پاک رہی۔ سیرت کا یہ اہم پہلو پوری انسانی برادری کے لیے بالعموم اور مسلم برادری کے لیے بالخصوص نمونۂ عمل ہے۔ موجودہ عہد میں اِس کی ضرورت واہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

۲۔ دوسرا دور مکی زندگی: یہ دور، سخت آزمائشوں کا ہے، جس میں اعلان نبوت فرمایا، دعوتِ دین کی ابتدا ہوئی اور ساتھ ہی مخالفتوں کا طوفان بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمالِ صبر واِستقامت کے ساتھ دعوت کے اُصولوں کی پاسداری فرمائی، مثلاً:

اللہ پر کامل توکل: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کو توحید کی دعوت دی، تو سب آپ کے خلاف ہوگئے۔ آپ کو سخت ترین اذیتیں دی گئیں، پتھر برسائے گئے، یہاں تک کہ جادوگر اور مجنون بھی کہا گیا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حال میں اللہ تعالی پر کامل توکل رکھا۔ اِس عملی سیرت سے پتا چلتا ہے کہ سخت سے سخت حالات میں بھی اللہ تعالی پر کامل توکل اور بھروسہ رکھنا چاہیے۔

حکیمانہ اُسلوبِ دعوت: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں خفیہ طور پر توحید کی دعوت دی۔

پھر جب اعلانیہ دعوت کا حکم ملا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر اپنی قوم کو جمع کیا، اور بڑی حکمت و دانائی سے اُن کے سامنے دین کی حقانیت بیان کی۔ اِس سے معلوم ہوا کہ جب کبھی کسی بڑے مقصد کا حصول پیش نظر ہو تو حکمت عملی اور منصوبہ بندی اِنتہائی ضروری ہے۔

صبر واِستقامت: مکی عہد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کرام نے کمال صبر واِستقامت کا مظاہرہ کیا، جیسے: حضرت بلال حبشی کو گرم ریت پر لٹایا گیا، حضرت سمیہ کو شہید کیا گیا اور بہت سے صحابہؓ کرام کو ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن اِس کا سبق آموز پہلو یہ ہے کہ کسی ایک فرد نے بھی اِسلام کو نہیں چھوڑا۔ لہٰذا حق کی راہ میں جب بھی مشکلات اور آزمائشیں آئیں، تو ہمیں بھی صبر واِستقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے، مکی عہد نبوی کا یہ اہم پیغام ہے۔

باطل سے سمجھوتہ نہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا آغاز فرمایا اور اہل مکہ نے آپ کے عزم مصمم کا اندازہ کرلیا، تو اُنھوں نے بڑے بڑے لالچ دیے، اور کہا: اگر آپ توحید کی دعوت چھوڑ دیں، تو آپ کے جو بھی مطالبات ہوں گے اُسے پورا کردیا جائے گا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف انکار کردیا، فرمایا: ”اگر تم لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی رکھ دو، تب بھی میں اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“ اِس طرح باطل پرستوں سے کوئی سمجھوتہ نہ کرکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیغام دیا کہ حق اور باطل میں ہرگز سمجھوتا نہیں ہوسکتا اور یہ کہ ہمیں اپنے ایمان کا سودا بھی نہیں کرنا چاہیے۔

۳۔ تیسرا دور مدنی زندگی: اِس عہد میں اِسلام کی ایک نئی صبح کا آغاز ہوا۔ ہجرت کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں اِسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اور اَیسے خوشنما وپُرامن معاشرے کی بنیاد ڈالی جو ساری دُنیا کے لیے ایک مثال بن گیا، مثلاً:

معاشرتی ہم آہنگی اور بھائی چارہ: مدینہ منورہ ہجرت کرجانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مہاجرین اور اَنصار کے درمیان مواخات (بھائی چارے کا رشتہ) قائم فرمایا۔ انصار نے بھی اپنے گھر اور مال و دولت، مہاجرین کے ساتھ تقسیم کیے اور اُن کے ساتھ ایک ایسا بھائی چارہ قائم کیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ لہٰذا موجودہ عہد میں بھی اگر ہمارے معاشرے میں مختلف پس منظر رکھنے والے لوگ ملیں، تو اُن کے ساتھ محبت، ہم آہنگی اور بھائی چارے کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور ایک دوسرے کے دکھ-درد کا بخوبی خیال رکھنا چاہیے۔

ریاست اور دستور سازی: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں باقاعدہ ایک ریاست کی بنیاد رکھی اور اِنصاف پر دستور (میثاقِ مدینہ) تیار کیا، جس میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ یہودیوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کے حقوق کا بھی خیال رکھا گیا۔

سیرت کا یہ پہلو بہرصورت ایک حاکم وقائد کے لیے انمول تحفہ ہے جو یہ بتاتا ہے کہ ہر طرح کی سیاست و معاشرت کی تعمیر وترقی اور اِستحکام کے لیے ایک عادلانہ قانون اور مساویانہ نظام کا ہونا اِنتہائی ضروری ہے۔

سیاسی اور عسکری حکمت عملی: مدنی دور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف دفاعی جنگوں (بدر، احد، خندق وغیرہ) میں اپنی سیاسی وعسکری حکمت عملیوں کا اِستعمال کیا۔ یہ جنگیں اِس بات کا ثبوت ہیں کہ ہرایک کو اَپنے دفاع، لاا ینڈآڈر اور ملک و قوم کی حفاظت کے لیے ہمہ دم تیار رہنا چاہیے، اور حکمت و منصوبہ بندی سے کام لینا چاہیے۔ کیوں کہ وہ قومیں کبھی بھی شاد وآباد نہیں رہتیں جو دِفاعی حکمت عملی اور منصوبہ بندی کے ساتھ آگے نہیں بڑھتی ہیں۔ اِس کا مشاہدہ موجودہ عالمی پس منظر میں بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

فتح مکہ اور عام معافی: فتح مکہ کا واقعہ اِس دور میں بھی اِنتہائی بیش قیمتی سبق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب فاتح مکہ کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے بدترین دشمنوں سے انتقام لینے کا پورا موقع تھا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو معاف کر دیا، اور فرمایا: ’’آج تمھارا کوئی مواخذہ اور گرفت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔‘‘

یہ واقعہ ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ طاقت وحکومت ملنے پر بھی ہمیں انتقام کے بجائے عام معافی اور درگزر سے کام لینا چاہیے۔ بلکہ آج جب کہ سیاست و معاشرت ہر سطح پر کمزوروں اور ماتحت لوگوں کو دَبایا جارہا ہے، طاقت و قوت کا ناجائز اِستعمال کیا جارہا ہے، اور عفوودرگزر کا تو کہیں نام ونشان بھی نہیں ہے، اَیسے میں سیرت کے اِس پہلو کو بالخصوص نافذ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

دین کا مکمل نفاذ اور مثالی معاشرہ: مدنی دور میں اسلام ایک مکمل دین کی صورت میں سامنے آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادات، معاملات، اخلاقیات، ریاست اور معاشرت کے اُصولوں کو نافذ کیا۔ اُس کے نتیجے میں ایک ایسا مثالی معاشرہ وجود میں آیا جہاں عدل، انصاف، مساوات اور اُخوت کی بنیاد پر معاملات کیے جاتے تھے۔ لہٰذا ہمیں بھی اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو سیرت کے مطابق ڈھالنا چاہیے تاکہ ہم ایک بہتر اور کامیاب ریاست ومعاشرت کی تشکیل کر سکیں۔

خلاصہ کلام: یہ کہ سیرت نبوی کے یہ تینوں ادوار اِنسانی زندگی کے لیے ایک مکمل رہنمائی کا مجموعہ ہیں۔ جو ہمیں بتاتے ہیں کہ کس طرح ایک انسان اپنی سیرت وکردار کو بہترین بنا سکتا ہے، کس طرح صبر و اِستقامت سے مشکلات کا مقابلہ کر سکتا ہے، اور کس طرح ایک مثالی ریاست ومعاشرت کی بنیاد رکھ سکتا ہے

❋❋❋

- **Dr. Jahangir Hasan Misbahi**
- Editor, Monthly Khizr e Rah, Allahabad
- Phone: +91 99108 65854
- E-Mail: mjhasan2009@gmail.com

تحقیقی سیکشن

ابراہیمی مذاہب میں امن وانصاف

حنا اطہر خاں

خالقِ کائنات نے اپنی مخلوق کے بارے میں قرآنِ مجید میں فرمایا ہے کہ انسان ظالم ہے —وہ اپنے آپ پر بھی ظلم کرتا ہے اور دوسروں پر بھی۔ انسان جاہل ہے —اپنی اور دوسروں کی صلاحیتوں سے ناواقف۔ اور انسان جھگڑالو ہے —اپنی ہی مانند مخلوقات سے منازعہ کرتا ہے۔ یہی وہ صفات ہیں جو انسان کو تصادم اور تشدد کی طرف مائل کرتی ہیں۔

اگر ہم انسان سے آگے بڑھ کر کائنات کے دیگر مظاہر پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ تصادم دراصل فطرت کی ساخت میں پیوست ہے۔ گویا ایک خودکار اور خود قائم نظامِ کائنات میں تنازع یا کشمکش دراصل تبدیلی اور بقا کے لیے محرّک کا کردار ادا کرتی ہے۔

معروف مفکر **جان پال لیڈراچ** **(John Paul Lederach)** کے مطابق، "تنازع تبدیلی کا محرّک ہے"—یعنی "Conflict is the motor of change"۔ اگرچہ یہ قول سماجی تنازعات کے حوالے سے کہا گیا ہے، مگر اس کی معنویت کائنات کے عمومی توازن پر بھی صادق آتی ہے۔

تمام آسمانی مذاہب — نہ صرف اسلام — انسانی فطرت میں اس رجحان کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کی اصلاح و نظم کے لیے ہدایات فراہم کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ غیر ذی شعور مخلوقات میں یہ کشمکش نظمِ فطرت کے مطابق رہتی ہے، جب کہ انسان اپنی عقل واختیار کے باعث اکثر حدود سے تجاوز کرجاتا ہے اور یہی انحراف ظلم اور جبر میں بدل جاتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں مذہب "جدوجہد" یا **جہاد** کے مفہوم کو متعارف کراتا ہے —یعنی ایسی جدوجہد جو انسان کو ظلم سے روکے اور عدل و توازن قائم کرے۔ بدقسمتی سے انہی تعلیمات کو غلط معنی پہنا کر مذہب کے نام پر تشدد کا جواز بنایا گیا۔ اس سے یہ گمان پیدا ہوا کہ بعض مذاہب فطری طور پر "پُرامن" ہیں اور بعض "پرتشدد"۔

یہ مضمون اسی غلط تصور کو واضح کرتا ہے کہ مذہب کو اس پیمانے پر پرکھنا خود مذہب کے جوہر کے ساتھ ناانصافی ہے، اور یہ کہ مذہب کو خود اپنے خلاف ایسے بیانیوں سے دفاع کی ضرورت کیوں اور کیسے پیش آتی ہے۔

انسانی تصادم اور "ہم بمقابلہ وہ" کا رویّہ

انسانی تنازعات کی جڑ اکثر "ہم اور وہ" کی نفسیات میں ہے —ایک ایسا فکری ڈھانچہ جو محدود وسائل کے خوف یا احساسِ کمی کے تحت اپنی بقا کو دوسرے کی نفی میں تلاش کرتا ہے۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ کوئی بھی علامتی شناخت — خواہ معمولی ہی کیوں نہ ہو— اس دوئی کو جنم دے سکتی ہے، جس کے نتیجے میں انسان دوسرے کو غیر، کمتر یا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔

اس پس منظر میں مذہب، بطورِ شناخت، ایک نہایت طاقتور ہتھیار بن جاتا ہے۔ ابراہیمی مذاہب خصوصًا اسلام ایمان کے اُس تصور پر قائم ہیں جس میں انسان اپنے خالق کے سامنے اپنی محدود عقل کو جھکا دیتا ہے تاکہ الٰہی حکمت کی وسعت کو سمجھ سکے۔ مگر جب یہ “سجدۂ عقل” علم و فہم کے بغیر انجام پاتا ہے، تو یہی مذہبی جذبہ آسانی سے استحصال کا شکار ہو جاتا ہے، اور یہی کیفیت اکثر مذہبی تشدد یا انتہا پسندی کو جنم دیتی ہے۔

اسلام اور مذہبی تشدد کا الزام

حالیہ تاریخ میں جب بھی مذہب اور تشدد کا ذکر آتا ہے تو **اسلام** کا نام فوراً ذہن میں آتا ہے۔ کیونکہ بیشتر مسلم ممالک اپنی ریاستی شناخت مذہب سے اخذ کرتے ہیں، اس لیے ہر جنگ کو مذہبی رنگ دینا آسان ہو جاتا ہے۔

1980ء کی دہائی میں سوویت یونین کے خلاف ”جہادی تحریک“ کے دوران مذہبی جذبات کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا، جس کے نتیجے میں کئی انتہا پسند گروہ وجود میں آئے جو بعد میں اپنے ہی معاشروں میں تباہی کا سبب بنے۔

فرقہ وارانہ تقسیم — جیسے کہ **شیعہ و سنی، دیوبندی و بریلوی** اختلافات —نے مسلم دنیا میں داخلی خلفشار کو بڑھایا۔ شام اور پاکستان جیسے ممالک کی مثالیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ بعض اوقات یہ تنازعات دراصل **سیاسی رقابتوں** (جیسے سعودی-ایران کشیدگی) کا مذہبی لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔

کیا مذہب واقعی پر تشدد ہے؟

کسی مذہب کو پر تشدد یا پُرامن کہنے سے قبل دو باتوں کا جائزہ ضروری ہے: کیا تشدد کا سبب واقعی مذہبی نظریہ ہے، یا یہ محض ”ہم بمقابلہ وہ“ کی شناختی سیاست ہے؟

اور دوسرا، مذہب کی اصل تعلیمات تشدد کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟

ولیم ٹی کیونا (William T. Cavanaugh) کے مطابق، تشدد کا باعث مذہبی نظریہ نہیں، بلکہ — "Otherness" یعنی دوسرے کو غیر سمجھنا — ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مذہب کی اصل روح کو دیکھا جائے۔

اسلام میں عدل کی اساس

اسلام کی بنیاد **عدل و انصاف** پر رکھی گئی ہے۔ لفظ "دین" عربی مادہ "دَین" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں "قرض" — یعنی وجود کا وہ قرض جو انسان اپنے خالق کا مقروض ہے۔ چنانچہ اسلام دراصل اس قرض کی ادائیگی کا راستہ ہے۔

قرآن میں "ظلم" (ظُلم) کی تعریف ہے "کسی چیز کو اس کے غلط مقام پر رکھنا"، اور "عدل" (عَدل) کا مفہوم ہے "ہر شے کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا"۔ یہی تصور **جوہان گالٹنگ (Johan Galtung)** کے اس نظریے سے ہم آہنگ ہے کہ "تشدد وہ عمل ہے جو کسی امکان کو اپنی تکمیل سے روکے"۔

یوں دیکھا جائے تو عدل نہ امن کے مترادف ہے نہ تصادم کے، بلکہ ان دونوں کے درمیان توازن کا پیمانہ ہے۔ عدل وہ میزان ہے جس پر امن اور اختلاف دونوں اپنی حد میں رہ کر بقا پاتے ہیں۔

عقل اور عدل امام علیؑ کی تعلیمات کی روشنی میں

اسلام میں عقل کو عدل کے قیام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ قرآن بار بار انسان کو تدبر اور تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ **امام علیؑ**، جنہیں نبی کریم ﷺ نے "باب العلم" کہا، فرماتے ہیں کہ "انبیاء کی بعثت کا مقصد عقلوں کے دفن شدہ خزانے کو ظاہر کرنا ہے"۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وحی عقل کو دبانے نہیں بلکہ جگانے آئی ہے۔

رضا شاہ کاظمی اپنی کتاب *Justice and Remembrance – Introducing the Spirituality of Imam Ali* میں لکھتے ہیں کہ امام علیؑ کے نزدیک "عقل مند وہ ہے جو ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھے"، اور اسی لیے "حقیقی عاقل ہی حقیقی عادل ہو سکتا ہے"۔

یہی نکتہ **امام غزالی** اور دیگر صوفی مفکرین کے ہاں بھی ملتا ہے — کہ عقلِ سلیم ہی عدلِ حقیقی کی اساس ہے۔

امام جعفر صادقؑ اور "خواص" کا فریضہ امام جعفر صادقؑ کے مطابق، قرآن کے باطنی معانی تک رسائی صرف "خواص" کو حاصل ہے — یعنی وہ اہلِ علم جو ظاہری الفاظ کے ماوراء غور و تدبر کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آج کے زمانے میں یہ خواص وہ تعلیم یافتہ افراد ہیں جو تنقیدی فہم رکھتے ہیں اور جن کی زندگی محض معاشی دوڑ تک محدود نہیں۔

قرونِ وسطیٰ میں ہر عالمِ دین دراصل ایک ہمہ جہت محقق ہوتا تھا جو دینی علوم کے ذریعے دیگر علوم تک پہنچتا تھا۔ آج اسی روایت کو بحال کرنے کی ضرورت ہے تاکہ تعلیم یافتہ اذہان کو مذہبی بصیرت کے ساتھ جوڑا جا سکے۔

نتیجہ امن نہیں، عدل کا نظریہ

جدید سیکولر تعلیم نے یہ غلط فہم پیدا کی ہے کہ مذہب عقل کے برعکس ہے، جب کہ حقیقت میں مذہب ہی عقل کو مقصد اور سمت دیتا ہے۔

لہٰذا ہمیں "امن" نہیں بلکہ "عدل" کی نظریاتی بنیاد کو دوبارہ زندہ کرنا ہوگا — ایسا نظامِ تعلیم جو اہلِ علم کے ذہنوں کو الٰہی بصیرت سے منور کرے اور انہیں اپنے وجود اور سماج میں عدل قائم کرنے کا محرّک بنائے۔ تبھی مومن اُس وعدے کو پورا کرے گا جو قرآن میں فرمایا گیا: اور تم اللہ کا حق اس طرح ادا کرو جیسا کہ اس کا حق ادا کرنے کا حق ہے، اور اسی کی راہ میں اس طرح کوشش کرو جیسا کہ کوشش کا حق ہے۔ (سورۃ الحج: ۷۸)

❖ ❖ ❖

حوالہ جات(References)

1. John Paul Lederach, *The Moral Imagination: The Art and Soul of Building Peace*, Oxford University Press, 2005.
2. William T. Cavanaugh, *The Myth of Religious Violence: Secular Ideology and the Roots of Modern Conflict*, Oxford University Press, 2009.
3. Johan Galtung, *Violence, Peace, and Peace Research*, Journal of Peace Research, 1969.
4. Reza Shah-Kazemi, *Justice and Remembrance – Introducing the Spirituality of Imam Ali*, I.B. Tauris, 2006.
5. Imam Abu Hamid al-Ghazali, *Ihya Ulum al-Din.*
6. Quran, Surah Al-Hajj (22:78).

- **Hina Athar Khan**
- Lahore, Pakistan
- Phone: +92 333 5651538
- E-Mail: Hinaatharkhan@gmail.com

نقش خیال

التجائے مسافر

(بہ درگاہِ حضرت محبوبِ الٰہیؒ دہلی)

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

نہاں ہے تیری محبت میں رنگ محبوبی
بڑی ہے شان بڑا احترام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار توام
دگر کشادہ جبینم گل بہار توام

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکہت گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

نظر ہے ابر کرم پر درخت صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاج باغباں مجھ کو

فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو

مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو

مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو

دلوں کو چاک کرے مثل شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

بنایا تھا جسے چن چن کے خار و خس میں نے
چمن میں پھر نظر آئے وہ آشیاں مجھ کو

پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنھوں نے محبت کا راز داں مجھ کو

وہ شمع. بارگہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شاداں مجھ کو

وہ میرا یوسف ثانی وہ شمع محفل عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرار جاں مجھ کو

جلا کے جس کی محبت نے دفتر من و تو
ہوائے عیش میں پالا کیا جواں مجھ کو

ریاض دہر میں مانند گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جان جاں مجھ کو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

* * *

غزل

شیخ ابو سعید صفوی

اب تیرا تصور ہی مستوں کی تلاوت ہے
واللہ یہی صورت بس آیت رحمت ہے

جس کو نہ یقین آئے وہ دیکھے یہاں آکر
کیا شانِ خداوندی مرشد کی حقیقت ہے

خدمت میں تری آکر معلوم ہوا مجھ کو
کعبہ ہے خمِ ابرو، قبلہ تری صورت ہے

اس زاہدِ خود سر کو معلوم نہیں شاید
دنیائے محبت میں بس عشق عبادت ہے

آیاتِ قرآنی سے یہ درس ملا مجھ کو
بس تیری اطاعت ہی مولی کی اطاعت ہے

ہے فخر سعیدؔ ہم کو ترے در کی گدائی میں
کیا تیری غلامی سے بڑھ کر کوئی دولت ہے

⁂

غزل

محمد شبیر سحر ایم اے علیگ

شعورِ زندگی کو شمعِ دل سے جگمگایا ہے
فنائے راہِ الفت نے پتہ کب اپنا پایا ہے

خرد کہتی رہی رُک جا، ہے راہِ عشق پُر آشوب
مگر دل نے ہمیشہ، ایسا لمحہ آزمایا ہے

قیامت تھے، قیامت ہیں، وہ لمحے آزمائش کے
تپیدہ دل نے فکرِ یار میں پہروں تپایا ہے

چوں عشق آمد خرد زنجیر شد،، ہے قولِ سودائی
سو اس رسمِ محبت کو، سدا دل سے نبھایا ہے

بس اک قطرہ تھا، لیکن غرقِ بحرِ معرفت ہوکر
جہانِ عشق و مستی کو دل اندر تک سمایا ہے

بہ شوقِ دیدہ و دل سے نگاہِ یار کا جلوہ
کہ صد سوزِ دروں سے ظاہر و باطن جلایا ہے

گمانِ وصل ہے دل میں، نہ تو فکرِ فراقِ یار
سحؔر نے اپنی ہستی کو سلیقے سے مٹایا ہے

* * *

سفرنامہ

روحانی سفر—کراچی سے نجف و بغداد تک

یہ سفرنامہ ایک ایسے اہلِ دل عاشق کی داستان ہے جس کے قدم جہاں جہاں پڑے وہاں یادِ حق کی خوشبو اور اولیاء اللہ کی تجلیات نے فضا کو معطر کر دیا۔ الفاظ سادہ ہیں مگر ان کے پیچھے دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی کیفیت، معرفت اور جذبِ عشق کی تپش محسوس ہوتی ہے۔

کراچی—سفرِ محبت کا آغاز

۹ اکتوبر ۲۰۲۵ء کو صدر اولیاء کونسل آف نارتھ امریکہ، ڈاکٹر مہدی کاظمی کراچی پہنچے۔ ہوائی اڈے پر اہلِ محبت نے والہانہ اور پُرخلوص استقبال کیا۔ چہروں پر مسکراہٹیں، آنکھوں میں اخلاص، اور دلوں میں عقیدت کے دیے روشن تھے۔

اسی شب دانش ورامش میں عرسِ محبوبین کی ایک روح پرور محفلِ نعت و قوالی سجائی گئی۔ مشہور قوال ماہر علی نے نعتیہ اشعار اور مناجات اس انداز میں پیش کیں کہ محفل میں سکوت و سرور، وجد و اشک سب یکجا ہو گئے۔ ہر بول میں ولایت کی خوشبو اور معرفت کی مٹھاس تھی۔

ان دنوں میں ڈاکٹر کاظمی نے کئی محبت بھری محفلوں، تذکرۂ اہلِ دل کی نشستوں اور ایک تقریبِ شادی میں شرکت فرمائی۔ جہاں بھی تشریف لے گئے، گفتگو میں حلم، لہجے میں نرمی، اور دل میں تصوف کی روشنی نمایاں تھی۔

تاریخی نوٹ:

کراچی برصغیر کے روحانی مراکز میں سے ایک اہم شہر ہے۔ یہاں صوفی روایت کی جڑیں ابتدائی ہجرتوں سے وابستہ ہیں، خواہ وہ حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کی درگاہ ہو یا درجنوں خانقاہیں جو محبت، خدمت اور تسلیم کے پیغام کی امین ہیں۔

درگاہِ بابا فرید — روح کی مٹی کا گھر

۱۴ /اکتوبر ۲۰۲۵ء کو قدم پاکپتن شریف کی متبرک خاک پر پڑے، وہی پاک سرزمین جہاں حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ (۱۱۷۳ء–۱۲۶۶ء) آرام فرما ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے عقیدت و نیاز کے ساتھ اعتراف کیا:

”میری روح کی اصل نسبت، میری حالت کی بنیاد، اور جو کچھ میں ہوں — سب بابا صاحب کی عطا ہے۔“

اسی روز عرسِ محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی محفل بھی منعقد ہوئی۔ معروف قوال فتح محمد قوال نے وجد آفریں کلام پڑھا۔ سماع کی کَیفیت نے فضا کو مستی اور سکون کے امتزاج میں بدل دیا۔ لمحہ بھر کے لیے زمان و مکان جیسے تھم گئے — بس محبت باقی رہ گئی، اور محبوبِ الٰہی کی یاد۔

قیام کے دوران اہلِ دل، اہلِ محبت اور سالکینِ راہِ طریقت سے ملاقاتیں رہیں۔ ہر گفتگو اصلاحِ باطن کا ذریعہ بنی، اور ہر لمحہ قرب و سکون کا سبب بنا۔

تاریخی و سیاقی نوٹ:

پاکپتن شریف، سلسلہ چشتیہ کا اولین مرکز ہے جہاں سے برصغیر میں تصوف، رواداری اور عشقِ الٰہی کا پیغام پھیلا۔ بابا فریدؒ نے شریعت و طریقت کے حسین امتزاج سے ایک ایسا نظامِ اخلاق تشکیل دیا جو آج بھی دلوں کو منور کرتا ہے۔ اُن کے خلفا میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور علاؤالدین صابر کلیریؒ جیسے اجل اولیاء شامل ہیں۔

سفرِ عشق کا اگلا باب — نجفِ اشرف

۱۷/ اکتوبر ۲۰۲۵ء کو قافلہ نجفِ اشرف روانہ ہوا۔ ہمراہ تھے پیر و مرشد داعیِ اسلام شیخ ابوسعید صفوی اور صاحبزادہ حسن سعید صفوی — جن کی تربیت، محبت اور نگاہِ کرم اس روحانی قافلے کی سمت متعیّن کرتی ہے۔

نجف میں امام علی علیہ السلام کے روضۂ اقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ حاضری محض ظاہری نہیں تھی، بلکہ روح کی بازگشت تھی۔ دل نے عرض کیا:

”یہی وہ در ہے جہاں معرفت کے دروازے کھلتے ہیں، یہی وہ مقام ہے جہاں عقل ادب میں روپوش اور عشق سجدہ ریز ہو جاتا ہے“

تاریخی و سیاقی نوٹ:

نجفِ اشرف اسلامی تاریخ میں روحانی علم و معرفت کا سب سے عظیم مرکز ہے۔ یہاں جامعۃ النجف اور حوزۂ علمیہ نجف صدیوں سے علومِ قرآن، فقہ، فلسفہ اور عرفان کا سرچشمہ ہیں۔ امام علیؑ کے روضے کے گرد وہ خاک ہے جسے اہلِ معرفت ”مقتلِ عقل و معراجِ عشق“ کہتے ہیں۔

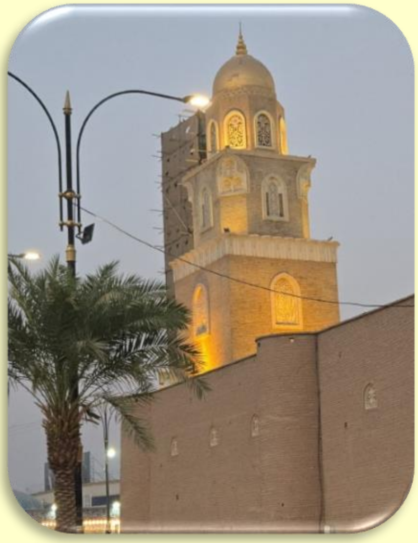

کربلا، حضرت عباسؑ اور مسجدِ کوفہ — شہادت، وفا اور معرفت کے مینار

نجف کے بعد قافلہ کربلا پہنچا۔ یہاں امام حسین علیہ السلام کے روضۂ اقدس اور حضرت عباس علیہ السلام کے روضۂ مبارک پر حاضری دی گئی۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں عشق و وفا اپنی انتہا کو پہنچتے ہیں۔

بعد ازاں مسجدِ کوفہ میں حاضری ہوئی، یہی وہ مسجد ہے جہاں امام علیؑ نے اپنے تاریخی خطبات ارشاد فرمائے اور جہاں سے اسلامی عدل و حکمت کے نقوش عالم میں پھیلے۔

تاریخی نوٹ:

کربلا اسلام کی روحانی و اخلاقی تاریخ کا محور ہے۔ واقعہ کربلا (٦١ ہجری) نے انسانیت کو ظلم کے مقابل قیام، حق کے لیے قربانی اور محبت کے لیے وفاداری کا ابدی پیغام دیا۔

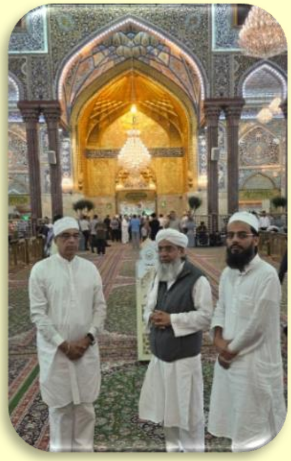

بغدادِ شریف اور کاظمین — ولایت کی محافل

سفر کا اگلا مرحلہ بغدادِ شریف تھا، وہ شہر جسے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (غوث الاعظم) کی نگاہِ کرم نے ولایت کا مرکز بنا دیا اور تصوف اسلامی سے دنیا کو روشناس کرایا۔

روضۂ مبارک پر سلام پیش کرتے وقت دل نے عرض کیا:

"یا غوث! آپ کی سخاوت سمندر ہے، ہم تو محض قطرہ — مگر قطرہ جب سمندر سے جڑ جائے تو فنا کی جگہ بقا پا لیتا ہے۔"

بعد ازاں کاظمین شریف میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اور امام محمد تقی علیہ السلام کے روضہ ہائے مقدسہ پر حاضری ہوئی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خاموشی ذکر بن جاتی ہے، اور سانس تسبیح کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

تاریخی و سیاقی نوٹ:

بغداد صدیوں تک علم و تصوف کا گہوارہ رہا۔ یہاں امام احمد بن حنبلؒ، امام شافعیؒ، جنید بغدادیؒ اور شبلیؒ جیسے اولیاء و علما نے علم و عرفان کے چراغ روشن کیے۔ کاظمین شریف میں مدفون ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام نے صبر، حلم اور علمِ الٰہی کی وہ مثالیں قائم کیں جنہیں تاریخ نے سنہری حروف میں محفوظ کیا۔

اختتام نہیں — ایک نئے سفر کی ابتدا

سفر کے اختتام پر ڈاکٹر مہدی کاظمی نیویارک واپس تشریف لے آئے، جبکہ پیر و مرشد ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے۔ مگر اصل سفر تو دل کے اندر جاری ہے — وہ سفر جو عشق سے شروع ہوتا ہے، لیکن معرفت پر پہنچ کر بھی ختم نہیں ہوتا۔

خلاصہ و دعا

یہ سفرنامہ محض ظاہری مسافت کا بیان نہیں — یہ عشق و ولایت کی ایک روحانی روداد ہے۔

یہ مرشد کی نگاہ کا فیض ہے،

اولیاء کی محبت کا تسلسل ہے

اہلِ بیت کی ولایت کا نور ہے

اور روح کی بیداری کا بیان ہے

اللہ کریم اس سفر کی برکات ہم سب کے دلوں کو منور کرے اور ہمیں بھی اس عشقِ حقیقی کے سفر پر گامزن فرمائے۔

آمین۔

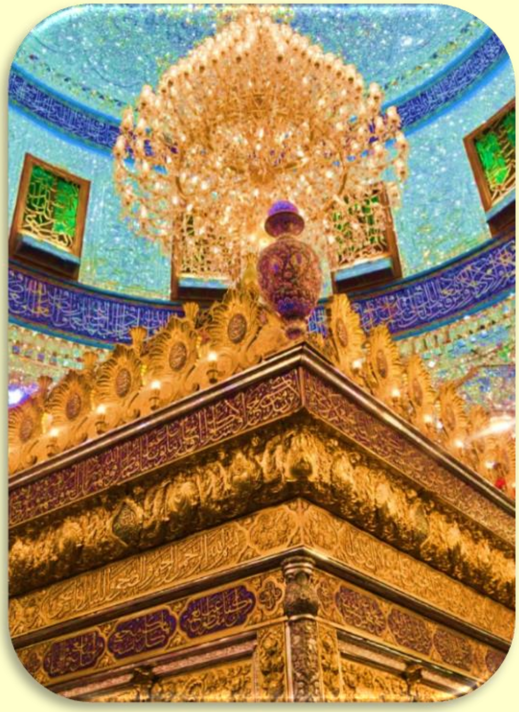

سفرنامہ تصاویر کی زبانی

کراچی، لاہور، پاک پتن، نجف اشرف، کربلا، بغداد اور کاظمین

عرس سلطان جی حضرت نظام الدین اولیاء
زیر صدارت: پیر زاہر چشتی صاحب
منتظم: ڈاکٹر مہدی کاظمی خاک پائے اہل بیت علیہ السلام (پاک پتن شریف)

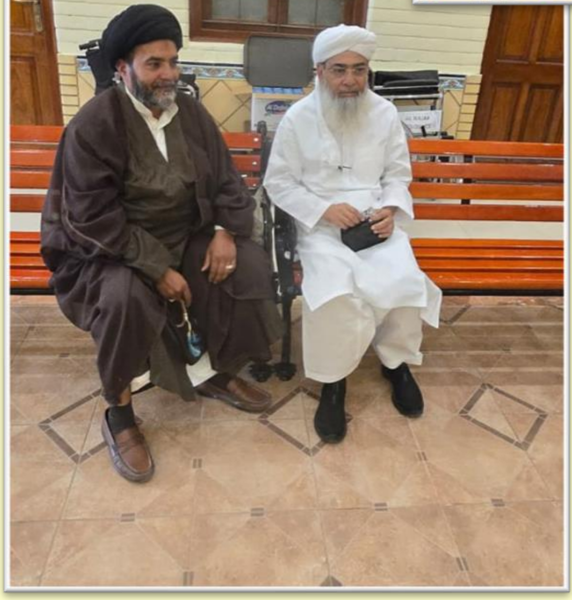

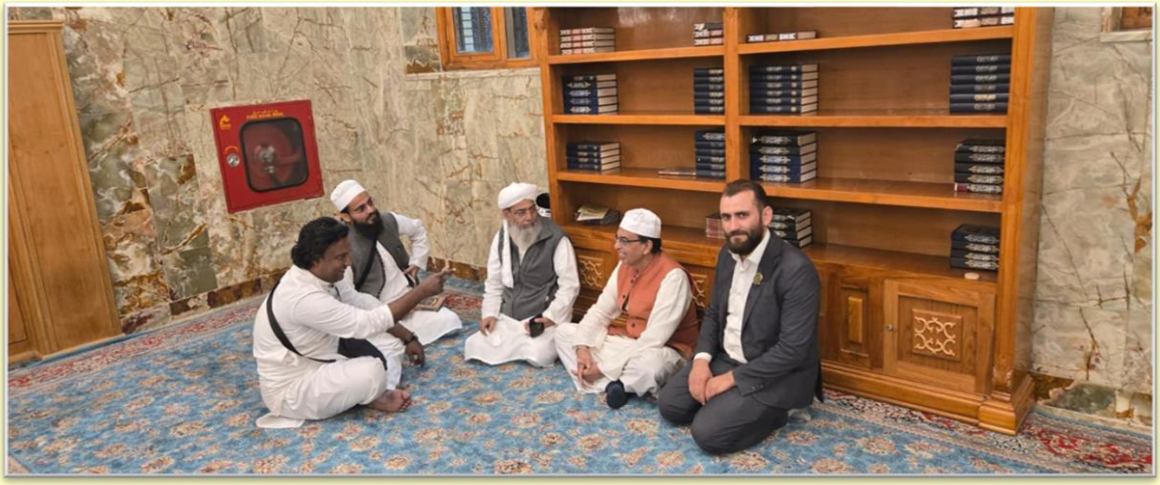

السلام عليك يا امير المؤمنين

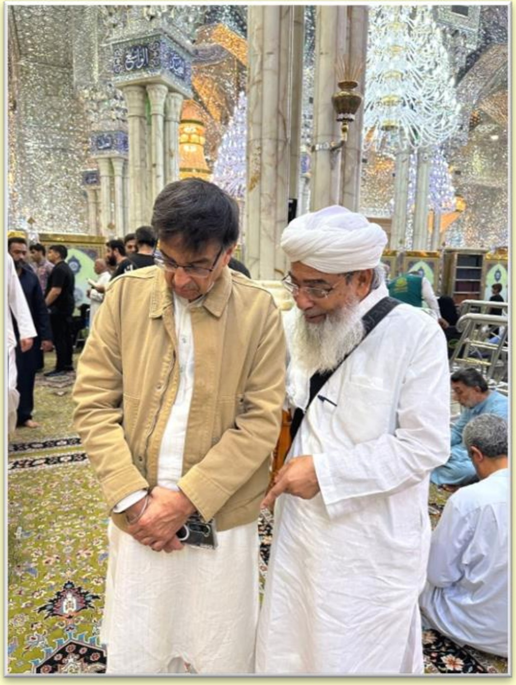

سلسلة الطريقة

حب سيدنا رسول الله
محمد ﷺ يجمعنا
السلام عليك يا غوث الثقلين

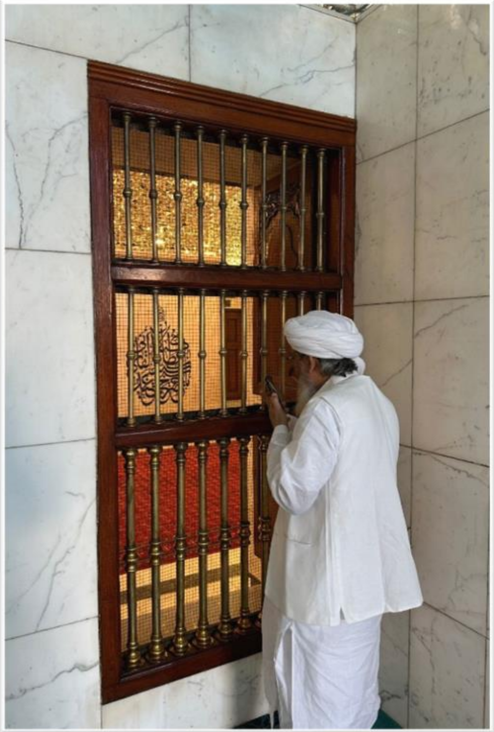

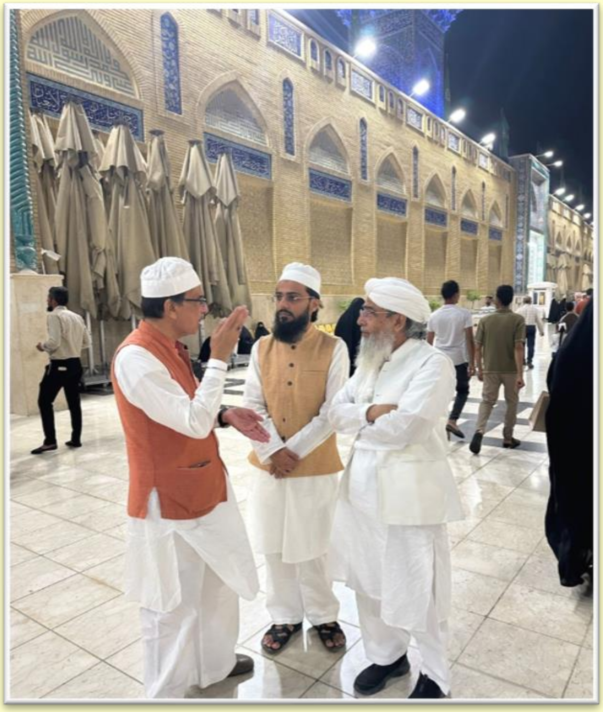
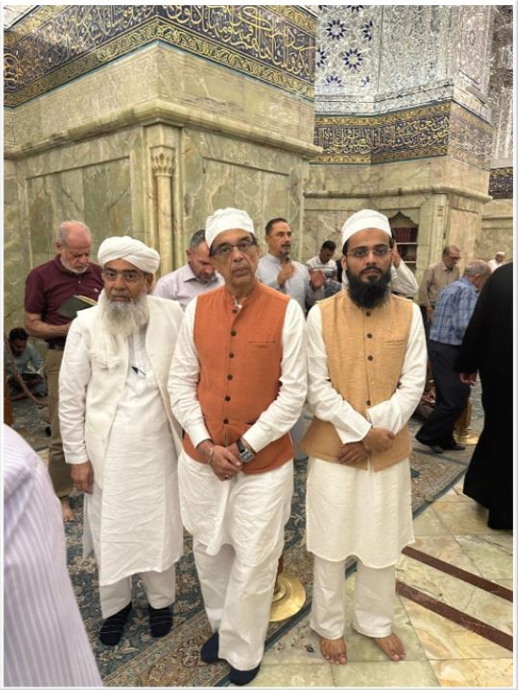

سرگرمیاں

اولیاء کونسل آف نارتھ امریکہ کی سرگرمیوں کی شان دار تکمیل

روحانیت، علم، ثقافت اور بین المذاہب ہم آہنگی کا کامیاب سال

نیویارک: اولیاء کونسل آف نارتھ امریکہ (ACNA) نے سال ۲۰۲۵ میں امریکہ بھر میں روحانیت، علم، صوفی روایت اور بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لیے اہم پروگرام منعقد کیے، جو کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ یہ سال اس اعتبار سے نمایاں رہا کہ خانقاہی روایت کو نئی زندگی ملی، علمی کوششوں میں اضافہ ہوا اور مختلف مذاہب کے درمیان محبّت اور احترام کے رشتے مضبوط ہوئے۔

روحانی محافلِ سماع

سال کا پہلا پروگرام ۲۶ اپریل ۲۰۲۵ کو مہوپیک، نیویارک میں محفلِ سماع کی صورت میں ہوا، جس میں سامی برادران قوال نے نعت، مناجات اور چشتی رنگ کی قوالیاں پیش کیں۔

۱۳ اور ۱۵ جون ۲۰۲۵ کو ہندوستان کے معروف صوفی رہنما شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ صفوی کی آمد پر مزید دو روحانی محافل کا اہتمام کیا گیا۔ ان محافل میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی اور چشتی سلسلے کی اصل تعلیمات یعنی عشق، خدمت اور اعلیٰ اخلاق کی یاد تازہ ہوئی۔

امام علی ریسرچ سینٹر کا افتتاح

۸ جون ۲۰۲۵ کو برونکس، نیویارک میں ”امام علی ریسرچ سینٹر“ کا افتتاح ہوا۔ یہ مرکز Hartford International University for Religion & Peace کا تحقیقی شریک ادارہ قرار پایا۔ افتتاحی نشست میں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے دانش وروں، اساتذہ اور مذہبی رہنماؤں نے شرکت کی۔ اس سینٹر کا قیام امریکہ میں علمی و روحانی تحقیق کے فروغ کی جانب ایک اہم قدم سمجھا جا رہا ہے۔

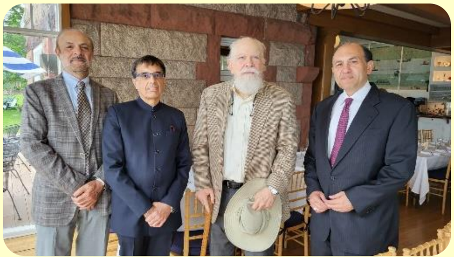

کتاب ''اُمِّ زہرہؓ'' کی تقریبِ رونمائی

۱۴ جون ۲۰۲۵ کو اولیاء کونسل سینٹر، مہوپیک میں حضرت خدیجہؓ کی سیرت پر مشتمل کتاب ''اُمِّ زہرہؓ'' کی رونمائی کی گئی۔ مصنفہ نصیر وارثی نے کتاب کے اہم نکات پر گفتگو کی، جبکہ شیخ صفوی نے حضرت خدیجہؓ کے کردار اور ان کی زندگی کی رہنمائی پر خطاب کیا۔ اس موقع پر ادبی گفتگو اور سوال و جواب بھی ہوئے۔

بین المذاہب ہم آہنگی: ''صلحِ کل'' کانفرنس

۱ مئی ۲۰۲۵ کو آئیونا یونیورسٹی، نیوراشل میں ''صلحِ کل'' بین المذاہب صوفی کانفرنس منعقد کی گئی۔ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد نے شرکت کی اور اس بات پر زور دیا کہ تصوف انسانوں کو قریب لانے اور دلوں کو جوڑنے کا پیغام دیتا ہے۔

مشترکہ یومِ آزادی

۱۶ اگست ۲۰۲۵ کو ہندوستان اور پاکستان کا یومِ آزادی پہلی بار مشترکہ طور پر اولیاء کونسل سینٹر میں منایا گیا۔ امریکہ، بھارت اور پاکستان کے پرچم ایک ساتھ لہرائے گئے، جس کا مقصد امن، بھائی چارے اور احترامِ انسانیت کے

جذبے کو اُجاگر کرنا تھا۔ تقریب میں قوالی، بھجن، کیرتن اور امن کا مشترکہ پیغام پیش کیا گیا۔ اس پروگرام کی اسپانسر شپ آفس آف اسمبلی مین نیڈر سائے گھ نے کی۔

Welcome
Auliya Council
of
North America
Mahopac, New York

مجموعی جائزہ

۲۰۲۵ کے پروگراموں نے ثابت کیا کہ امریکہ میں تصوف کا پیغام مؤثر انداز میں پھیل رہا ہے۔ علمی سرگرمیوں نے نئی راہیں کھولی ہیں، مختلف ثقافتوں اور مذاہب کے درمیان ہم آہنگی بڑھی ہے اور نوجوان نسل صوفی ورثے سے جڑ رہی ہے۔ اولیاء کونسل آف نارتھ امریکہ نے اس سال محبت، علم اور امن کی وہ بنیاد مضبوط کی ہے جو مستقبل میں مزید مثبت اثرات مرتب کرے گی۔

* * *

- **Md Aftab Alam**
- Media Manager, Auliya council of North America
- Phone: +91 9931001116
- E-Mail: aftabalam9006253472786@gmail.com

انگلش سیکشن

South Asian Sectarianism A Comparative Study

Dr. M. Mehdi Kazmi

1 Sectarianism: A Wound in the Soul of the Subcontinent

In our beloved subcontinent, there exists an ailment so deeply entrenched that it has fragmented societies, fractured the collective soul, and made us a spectacle of ridicule before the world. This disease is sectarianism. What was meant to be a beautiful and unifying religion—Islam, with its profound message of justice, mercy, and brotherhood—has too often been reduced to bitter sectarian identity wars.

Each group insists that theirs is the “rightful sect” and the truest interpretation of Islam, even though most adherents possess little more than a superficial understanding of their own sectarian narrative. Why, then, do people cling so fiercely to these fractured identities? For some, it is a search for safety within the crowd, a way to ease the vulnerability of standing alone. For others, it is a refusal to acknowledge the legitimacy of how others believe and live. Sectarian affiliation can feed narcissism, turning sect leaders and heroes into objects of near - worship, revered as holier than all others. It can also provide a false sense of pride, a fragile identity propped up by declaring others inferior or misguided.

At its root, sectarianism panders to a primitive and destructive need simply to belong—at all costs. This unchecked need fuels hatred and enmity. Hate-mongering becomes a sport, a tool of manipulation, and an exercise of unrestrained power in the hands of those who thrive on these jungle-law narratives. The result is a society torn apart, where the richness of Islamic heritage is obscured by petty rivalries, and the spirit of unity is sacrificed at the altar of sectarian pride.

2 The Need for Comparison

To compare and contrast who we are in relation to the Other is a natural human tendency. Human beings make sense of themselves by seeing themselves mirrored, challenged, or complemented in others. This comparative instinct becomes particularly vivid in societies marked by plurality—whether of religions, sects, or cultures. The South Asian subcontinent, home to vibrant Muslim communities of diverse orientations, offers fertile ground for such comparative work.

In my course on Interreligious Studies, I encountered an article in *Understanding Religion: Theories and Methods for Studying Religiously Diverse Societies* (Tweed & Fitzgerald, 2021). It describes a scholarly method of comparing religions in ways that are fair, empathetic, and illuminating. I realized that this same methodology could be applied to the study of sects. Too often, sectarian comparison is undertaken with an agenda—to assert superiority, delegitimize the Other, or fortify a sense of collective pride. Such approaches only deepen divisions. A more reflective and scholarly approach allows us to view sects not as battlegrounds for proving rightness but as distinct expressions of Islam, each with its own rich colors and profound ways of creating meaning.

3 Rethinking the Concept of "Sect"

The very word *sect* often carries negative associations—fragmentation, schism, division. Yet, as Byron Earhart (1993) argued in *Religious Traditions of the World*, religion itself may be defined as a distinctive set of rituals, beliefs, doctrines, institutions, and practices through which members of a tradition establish, maintain, and celebrate a meaningful world. If we borrow this definition, *sect* can be rehabilitated as well.

A sect may not be a religion in and of itself, but it functions as a mode of expression within the larger religious tradition. It provides rituals and doctrines, structures of authority and institutions, ways of experiencing and embodying faith, and above all, a coherent worldview that addresses life's enduring questions.

Here we might follow Lewis R. Rambo (1993) and Ninian Smart (1998), who understood religion as worldview. Smart outlined six key dimensions: doctrinal/philosophical, mythic/narrative, ethical/legal, ritual/practical, experiential/emotional, and social/institutional. When applied to sects, these categories reveal how each group within Islam develops its own balance of emphases. Some may privilege ritual and law, others experience and devotion, others authority and leadership. The task of comparative sect studies, therefore, is to notice these emphases, analyze them carefully, and understand their meaning for adherents.

4 The Challenge of Comparison

Comparative study of sects has long been central to Islamic scholarship, but it also invites criticism. Jonathan Z. Smith (1990) warned that careless comparisons become "magical acts" that conjure false similarities, flattening distinct traditions. Yet comparison is unavoidable: human beings always understand the unfamiliar in light of what they already know. The challenge is to compare responsibly—attending both to similarities and to differences.

As Paul Hedges (2021) argues, meaningful comparison requires a balance of comparison and contrast. Overemphasizing patterns, as earlier scholars such as Mircea Eliade (1959) often did, risks erasing the distinctiveness of sects. Responsible comparison looks beyond doctrines alone and attends to lived practice—rituals, behaviors, institutions, and the cultural worlds in which sects are embedded.

5 Comparative Glimpses: Deobandi, Barelvi, and Shia Traditions

Applying these principles to Deobandi, Barelvi, and Shia sects reveals both shared frameworks and profound divergences. All three draw from the Qur'an, Sunnah, and Islamic history, yet each has developed unique ways of understanding authority, salvation, ritual life, and identity.

- **Deobandi**: Emphasizes purification and austerity. Doctrines stress strict *tawḥīd* and avoidance of *bidʿa* (innovation), grounding themselves in Hanafi jurisprudence and rigorous madrasa scholarship. Rituals are simple—mosque prayers, Qur'an study, and avoidance of practices seen as corruptions, such as shrine visitation or musical devotion. The culture reflects sobriety and reform, shaped by resistance to colonial modernity (Metcalf, 1982).
- **Barelvi**: Affirms Sufi cosmology and devotional practices. Beliefs include the Prophet's spiritual presence (*ḥāḍir o nāẓir*), the intercession of saints, and ongoing miracles of the unseen world. Rituals are rich and embodied: *mawlid* celebrations, *ʿurs* festivals, shrine visitations, devotional poetry (*naʿat*), and Qawwali. Barelvi culture is deeply tied to South Asian folk traditions, music, and poetry, with shrines serving as spiritual and social centers (Sanyal, 1996).
- **Shia**: Distinct in its doctrine of the Imamate. Shia Muslims affirm that divinely guided Imams from the Prophet's family are the rightful leaders of the community, sinless and authoritative interpreters of faith. Rituals focus on memory and mourning, especially *ʿAshura* commemorations of Imam Husayn, *Arbaʿeen* pilgrimages, *majlis* gatherings, and *matam* (ritual chest-beating). Shia identity is profoundly shaped by Karbala, giving rise to a theology of sacrifice, resistance, and justice. Its culture is transnational, sustained by law, philosophy, poetry, and dramatic re-enactments (*taʿziya*) (Pinault, 1992; Hyder, 2006).

6 Comparative Insights

Using Hedges' comparative lens, several insights emerge:

- **Authority**: Deobandis trust texts and scholars; Barelvis extend authority to saints and the Prophet's spiritual presence; Shias locate authority in the lineage of Imams.

- **The Human Problem**: Defined variously as innovation (Deobandi), forgetfulness of devotion (Barelvi), or injustice and betrayal (Shia).
- **Salvation**: For Deobandis, it lies in purification of practice; for Barelvis, in intercession and devotion; for Shias, in loyalty to the Imams and participation in the memory of Karbala.

Comparison shows that while all three sects affirm Islam’s shared foundations, they embody them in profoundly different ways. Outward similarities—communal gatherings, commemorations, recitations—mask very different functions: Deobandis seek to protect orthodoxy, Barelvis to cultivate love and intercession, and Shias to embody justice and sacrifice.

7 Conclusion

In the end, comparison of sects, when done critically, is not about collapsing differences into sameness. It is about appreciating the distinct worlds of meaning each sect creates, while recognizing the broader human search for truth, justice, and devotion. To compare Deobandi, Barelvi, and Shia traditions responsibly is to see both their common Islamic heritage and their unique responses to enduring questions of authority, mediation, and the path to God.Far too often, our sectarian leaders expend their energies in spewing venom at one another, mistaking hostility for strength and aggression for a shallow performance of manliness. Their self-styled glorification, cloaked in bizarre titles, betrays a striking absence of training, scholarly engagement, or even the slightest inclination toward understanding the Other. In a culture of exaggerated hero-worship, so prevalent across the Subcontinent, followers readily align themselves behind these combative figures, addressed as “Hazrat this” or “Hazrat that,” without critical reflection.

It is incumbent upon all of us—leaders and followers alike—to cultivate the discipline of learning from and about other sects, other traditions, and other worldviews. The world does not, and cannot, revolve solely around the narrow orbit of one’s sectarian identity or leadership. To recognize that their self-righteous posturing is not the mantle of the Prophet ﷺ, but in fact a negation of his message and mission, is a realization that can only emerge through genuine encounter with the breadth and richness of other communities. Such engagement requires openness of heart and clarity of mind, guided by thoughtful method rather than impulsive hostility, and by the desire to learn rather than the compulsion to denounce.

8 References

- Earhart, B. D. (1993). *Religious Traditions of the World*. HarperCollins.
- Eliade, M. (1959). *The Sacred and the Profane: The Nature of Religion*. Harcourt, Brace & World.
- Hedges, P. (2021). *Understanding Religion: Theories and Methods for Studying Religiously Diverse Societies*. University of California Press.
- Hyder, S. A. (2006). *Reliving Karbala: Martyrdom in South Asian Memory*. Oxford University Press.
- Metcalf, B. D. (1982). *Islamic Revival in British India: Deoband, 1860–1900*. Princeton University Press.
- Pinault, D. (1992). *The Shiites: Ritual and Popular Piety in a Muslim Community*. St. Martin's Press.
- Rambo, L. R. (1993). *Understanding Religious Conversion*. Yale University Press.
- Sanyal, U. (1996). *Devotional Islam and Politics in British India: Ahmad Riza Khan Barelwi and His Movement, 1870–1920*. Oxford University Press.
- Smart, N. (1998). *The World's Religions*. Cambridge University Press.
- Smith, J. Z. (1990). *Drudgery Divine: On the Comparison of Early Christianities and the Religions of Late Antiquity*. University of Chicago Press.
- Tweed, T. A., & Fitzgerald, T. (Eds.). (2021). *Understanding Religion: Theories and Methods for Studying Religiously Diverse Societies*. University of California Press.

- **Dr. M. Mehdi Kazmi**
- President, Auliya Council of North America
- Phone: +1 (914) 525-1945
- E-Mail: montesynapse@gmail.com

Reaction Paper: Peace and Justice in the Abrahamic Traditions

Hina Athar Khan

Humans are ‘oppressive’; they oppress their own selves as well as others. They are ‘ignorant’; of their potential and that of others. And they are ‘quarrelsome’ among themselves.[1] This is how the Creator describes creation in the Islamic revelation, the Quran. These are the set of attributes, among others, predisposing humans to conflict and violence. Look beyond humans across all life-forms, and we will notice ‘causes’ of conflict woven in to the fabric of nature at large. In fact, in a purpose built self-sustaining universe, it seems conflict is an essential catalyst for change and sustenance. John Paul Laderach says that conflict is a ‘motor of change’. Though Laderach is addressing social conflict when he says ‘conflict flows from life and is a life giving opportunity’, it is not inconceivable to apply this idea universally and to the universe.[2]

Religious scriptures across traditions, and not just Islam, verify conflict as a part of human nature and, as with all other natural human predispositions, necessary for the sustenance of self and society. It is for this reason that religious texts have extensively addressed the human tendency to conflict and provides wisdom for its management. This is so because unlike non rational life-forms where conflict remains harmonious with the natural design, humans are capable of perverting towards extremes that result in violence and oppression.

---

[1] *Quran* 33:72 and 18:54

[2] Lederach, John Paul. The Little Book of Conflict Transformation. Intercourse, PA: Good Books, 2003. Pg 4-8

Teachings pertaining to management of and defense against such perversions are essentially the religious ‘struggle’. It is often these same teachings that are misrepresented to *propagate* violent conflict for motives unrelated to religion itself. This has led to an unjust framing of religions as ‘violent’ or ‘peaceful’. Using the inter- and intra-religious context of Islam, this paper will explore why such a framing is an injustice to the essence of the religion. Further, the paper will attempt to build a case for how religion itself can and must defend itself against such narratives.

Human conflicts stem primarily from an ‘*Us vs* Them’ mentality that seeks to gain and preserve the *Us*, in an environment of actual or perceived limited resources.[3] It has been researched to show that *any* identity marker, even an inconsequential one, may instigate an ‘*Us vs Them*’ perception, leading to dehumanization and subsequent oppression.[4] In such a dynamic, one may only imagine how strong the *mis*-use of religion as an identity marker may be. Religions, especially Abrahamic traditions, rely on a faith-based belief system, that require momentary surrendering of human rationality before the understanding of God and His wisdom. This rationality is often asked to be parked in favor of reflection that reveals a Wisdom beyond immediate logic. However, a generalized misunderstanding with regards to surrender before God, paired with a lack of knowledge of the religion, renders many religiously-situated people vulnerable to manipulations. This is what many times lead to mass violence in the name of religion.

In the recent times, Islam garners an instant recall globally when speaking of religious violence or violent religions. In and inter-religious context, Islam is the most predominant religion among nations that identify a state religion.[5] Every war may therefore quite possibly be deemed a *religious* war or at least leans upon religion to some degree. Islamic sentiment in these countries was misused most fervently in the '*jihadist*' movement against the Soviet Union as recent as the 1990's and as a result many religiously inspired extremist movements are also founded in Muslim states.[6] These extremist groups have been fighting in the name of religion within as well as outside of their host states. Viewed simplistically, all conflicts stemming from and with Muslim nations could be deemed '*religious wars*'. In an intra-religious context, Muslims find themselves divided into sects and schools of thought – infighting among which often garners attention in the international media in a manner similar to the "Troubles" where often ethno-nationalist conflicts take cover of sectarian belief systems. Syria[7] and Pakistan are prime examples of complicated and violent predicaments that originate from an evident Saudi-Iran rivalry.[8] There are essentially two ways to understand IF a religion is in fact violent. One, to study whether the instances of conflict and violence can be stemmed to the *Us vs Them* phenomenon, in such a case the conflict is a matter of identity and not the religion despite its use of religious sentiment. Second, to understand the essence of the religion and explore its views on conflict or violence in such light. William T. Cavanaugh aptly challenges the notion that it is religious ideology that truly causes violence, or any more violence, than a secular ideology[9] – the examples above lead to the conclusion that most violent conflicts are quite possibly a result of identity and otherness. A focus is therefore required on the essence of religion, in this case Islam, and understand how Islam views violence. Such a focus, if possible would build a theory of peace that can at best dismantle identity based conflicts and at the very least curb the use of religion in such conflicts that are essentially bereft of true religious cause.

---

[3] powell, john a. *The Power of Bridging: How to Build a World Where We All Belong*. Boulder, CO: Sounds True, 2024. *Is othering natural*, pg 48-54

[4] van Loon, A., Goldberg, A. & Srivastava, S.B. Imagined otherness fuels blatant dehumanization of outgroups. *Commun Psychol* **2**, 39 (2024). https://doi.org/10.1038/s44271-024-00087-4

---

[5] Pew Research Center. "Many Countries Favor Specific Religions, Officially or Unofficially." *Pew Research Center*, October 3, 2017. https://www.pewresearch.org/religion/2017/10/03/many-countries-favor-specific-religions-officially-or-unofficially/.

[6] International Crisis Group. "Exploiting Disorder: Al-Qaeda and the Islamic State." *International Crisis Group*, April 29, 2014. https://www.crisisgroup.org/global/exploiting-disorder-al-qaeda-and-islamic-state.

[7] Council on Foreign Relations. "The Sunni-Shia Divide." *Council on Foreign Relations*, August 20, 2009. https://www.cfr.org/article/sunni-shia-divide.

[8] Rathore, Shahzeb Ali. "The Saudi-Iran Factor in Pakistan's Sunni-Shia Conflict." *Middle East Institute*, May 30, 2017. https://www.mei.edu/publications/saudi-iran-factor-pakistans-sunni-shia-conflict.

Islam is a religion that is deeply rooted in the concept of rightful dues and justice. Infact derived from the Arabic lexicon of the word for religion Din; religion is a debt of existence owed to God, a trusted deposit (Amanah). Thereby Islam becomes a means of repayment of this debt. This can be thought of as doing justice by God, a theme often repeated in the Quran. Further, the terms Zulm (oppression) as well as its antonym Adl (justice) mean ‘putting something out of its rightful place’ and ‘putting things in their rightful place and avoiding excess or deficiency’ respectively.[10] This rings well with Johan Galtung’s idea of violence being such act that restrict the ability to reach or actualize a latent potential – a rightful due.[11] Studied in this light, justice is neither the existence of peace nor violence but a purpose in and of itself. Justice is the scale on which peace and conflict may be brought to perfect equilibrium. Where peace does not stop the ‘motor of change’, and conflict does not manifest into violence. Therefore, a religion may not be framed as peaceful nor violent, but better framed as *just* or *unjust*. Justice is at once minutely intrinsic, where a person must do everything to fulfill their individual potential – including the just use of intellect, health, limbs, etc; and vastly extrinsic, propelling the actualization of potential among other individuals, communities, and the world at large. As for Islam, it repeatedly calls for justice.

This form of justice calls individuals, especially believers towards the use of intellect, a tool essential to the most appropriate appraisal of a potential.

---

[9] Cavanaugh, William T. "Does Religion Cause Violence?" *Harvard Divinity School Bulletin*, Spring 2000. https://bulletin.hds.harvard.edu/does-religion-cause-violence/.

[10] Ibn Faris, Ahmed "Maqayis al-Lugha" (معجم مقاييس اللغة)

[11] Galtung, Johan. "Violence, Peace, and Peace Research." *Journal of Peace Research*, Vol. 6, No. 3 (1969), pp. 167-191.

After all, the Quran itself exhorts believers repeatedly and with urgency to contemplate and reflect on essential realities of existence – using their intellect and critical thinking capabilities. Imam Ali, who is the Gate of Knowledge according to the widely accepted tradition of Prophet Muhammad (PBUH) says with regards to the purpose of Revelation and sending forth of the prophets was to unearth the buried treasures of intellects.[12] This demonstrates that religion, especially revelation, is meant to evoke intellect, not stifle it. Reza Shah-Kazemi in his book, *Justice and Remembrance – Introducing the Spirituality of Imam Ali*, presents that according to Imam Ali the intellectual as one 'who puts all things in their proper place', and that therefore, 'only the true intellectual can be fully just'.[13] This analysis is common to scholars of Islam such as Imam Al-Ghazali, who have dug deeper into the esoteric realities of Islam.
This calls into question, who are these people – who are the ones upon whom it is now incumbent to refine and apply their intellects for the cause of justice. Here we may turn to one of the most prominent and influential Islamic scholars, Imam Jafar Sadiq's teachings regarding understanding the Revelation of God, the Quran. According to Imam Jafar, the 'elite' (khawwas) of the Muslim community must apply their intellects to understand the Quran beyond its literal expression.[14] That is, they must explore deeper meanings and connotations of the revelation to unearth the buried treasures. In current times, the elites of the Muslim community are *all* those individuals blessed with basic education and critical thinking skills, and who are not consumed with provision of basic necessities. Using this, one can quite easily identify all higher academia educated individuals as the demographic that fits this description of the elite. While this may

---

[12] Shah-Kazemi, Reza. 2006. *Justice and Remembrance: Introducing the Spirituality of Imam 'Ali*. New York: I.B. Tauris in association with the Institute of Ismaili Studies. Appendix one.

[13] Shah-Kazemi, Reza. 2006. *Justice and Remembrance: Introducing the Spirituality of Imam 'Ali*. New York: I.B. Tauris in association with the Institute of Ismaili Studies. Pg 35.

[14] Ja'far al-Ṣādiq, Farhana Mayer, Paul Nwyia, سلمي، محمد بن الحسين،, and Muḥammad ibn al-Ḥusayn Sulamī. *Spiritual Gems: The Mystical Qur'āN Commentary Ascribed to Ja'far Al-ṢāDiq as Contained in Sulamī's ḤAqā'iq Al-TafsīR from the Text of Paul Nwyia*. Louisville, Ky.: Fons Vitae, 2011. pg 1

seem like a bizarre idea, it isn’t really so. In the middle ages, *ALL* Muslim scholars, by definition, were in fact those who were well-versed in the sciences of religion first, and through their exploration of the Revelation, experts of other sciences.

One may say that the western modern education system, with its secular nature, has led to the unfair conclusion that religion is irrelevant to the development of critical and design thinking skills, and that it may in fact be a stifling force for reason, intelligence, and intellect. It is unfortunate that the misuse of religious texts to manipulate possibly honest religious fervor has only confirmed this deduction.

Therefore, not so much a theory or peace but a theory of justice would require a reimagined reintroduction of a process by which the intellects of literate and educated minds are enlivened with deeper realities of religious revelations. It would most necessarily need to be integrated into and beyond the education systems to nurture *every student and scholar*, into religiously motivated justice upholders (instead of peacebuilders), starting with their own selves.[15]

Only then will believers would have God the reverence ‘rightfully due to Him’, and have striven for Him ‘in a rightfully due strife’.[16]

- **Hina Athar Khan**
- Lahore, Pakistan
- Phone: +92 333 5651538
- E-Mail: Hinaatharkhan@gmail.com

---

[15] Springs, Jason, “Structural and Cultural Violence in Religious Peacebuilding” in Omer, Atalia, et al., eds. The Oxford Handbook of Religion, Conflict, and Peacebuilding. Oxford University Press, 2015.

[16] *Quran* 22:74, 22:78

Poor Situation of Education in Muslim Society in India A Call to Action

Dr. Jahangir Ahmad

The educational status of Muslims in India paints a concerning picture. Despite the strong emphasis Islam places on acquiring knowledge, Muslim communities lag behind in literacy, socio-economic development, and access to quality education. According to the 2011 Census, the literacy rate among Muslims in India stands at 68.5%, significantly lower than the national average of 74%. The disparity is even more pronounced among Muslim women, whose literacy rate is only 53.2%. These statistics underscore the urgent need for introspection and action to address the educational crisis facing the community.

The Quranic Emphasis on Knowledge

The Holy Quran places immense importance on the pursuit of knowledge. The divine message repeatedly stresses that education is a vital tool for personal and communal development. All Mighty Allah says in Surah Az-Zumarقل هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون

..."Are those who know equal to those who know not?" (Quran 39:9)
Furthermore, Allah commands believers to continually seek knowledge in Surah Tahaوقل رب زدنی علماً

"And say: 'My Lord! Increase me in knowledge.'" (Quran 20:114)
These verses reflect Islam’s emphasis on lifelong learning and the transformative power of education.

The Teachings of Prophet Muhammad (PBUH) Emphasizing on Knowledge

Prophet Muhammad (PBUH) also underscored the importance of acquiring knowledge. He said-طلب العلم فريضة على كل مسلم:

"Seeking knowledge is an obligation upon every Muslim." (Sunan Ibn Majah, Hadith 224) In another narration, the Prophet (PBUH) declared:

"The ink of the scholar is more sacred than the blood of the martyr." (Jami' al-Tirmidhi)

These teachings serve as a reminder of the critical role education plays in the spiritual and social uplift of individuals and communities.

Challenges Facing Muslim Education in India

Despite the religious emphasis on education, Muslims in India face several challenges that hinder their educational progress:

١. **Low Literacy Rates**: The literacy rate among Muslims is below the national average, reflecting widespread educational deprivation. The gap is particularly stark among Muslim women, perpetuating gender inequality in education.

٢. **Limited Access to Educational Institutions:** Many Muslim-dominated regions lack quality schools, colleges, and universities. This lack of infrastructure limits opportunities for higher education and professional growth.

٣. **Economic Marginalization:** Economic deprivation among Muslims further exacerbates the issue. Poverty and financial instability make it difficult for families to prioritize education over basic survival needs.

٢. **Stereotyping and Discrimination:** Social and institutional biases against Muslims often lead to exclusion from mainstream educational opportunities, compounding the community's challenges.

A Call to Action

Addressing these challenges requires a multifaceted approach involving community participation, institutional support, and policy interventions. Here are some key steps to consider:

١. Establish Quality Educational Institutions

The Muslim community must prioritize the establishment of quality schools, colleges, and universities that cater to the educational needs of their children. These institutions should focus on providing modern education while retaining cultural and religious values. Public-private partnerships and community-based initiatives can play a pivotal role in this endeavor.

٢. Promote Literacy and Vocational Training

Literacy programs and vocational training initiatives are crucial for equipping individuals with skills to access better job opportunities. Emphasis should be placed on women’s education to bridge the gender gap and empower Muslim women.

٣. Foster Community Involvement

Community leaders, parents, and teachers must actively support educational initiatives. Encouraging parental involvement in children’s education can create a more supportive learning environment.

٢. Advocate for Government Support

The government must implement policies that address the unique challenges faced by Muslims in education. Special scholarships, reservation policies, and the inclusion of Muslim-majority areas in development schemes can help bridge the gap.

٥. Combat Stereotypes and Discrimination

Efforts to challenge stereotypes and foster social harmony are essential. Media, civil society, and educational institutions must work to create an inclusive environment where Muslim students feel valued and respected.

Conclusion

The Quran and Hadith emphasize the transformative power of education. For the Muslim community in India, recognizing the centrality of education is critical to overcoming socio- economic challenges and achieving progress. By establishing quality institutions, promoting literacy, and fostering community involvement, Muslims can chart a path toward empowerment and prosperity.

- **Dr. Jahangir Ahmad**
- Assistant Professor, R.S. More College, Govindpur,
  Dhanbad, Jharkhand.
- Phone:
- E-Mail:

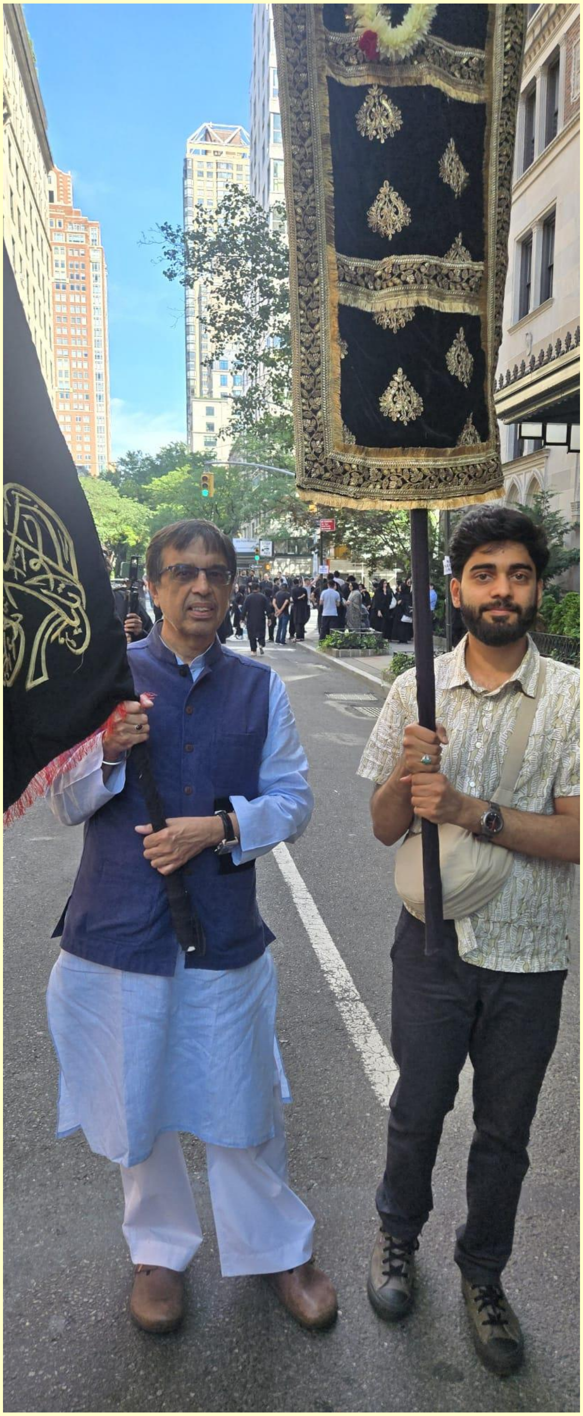

AULIYA COUNCIL OF NORTH AMERICA

ACNA promotes the Sufi path of love, peace, and unity through sama‘ (qawwali), cultural events, and educational initiatives—keeping the legacy of South Asian Auliya alive and relevant today. Truly, a Sufi Path: A Journey of Love, Peace & Progress.